ذوالقعدہ ۱۴۴۱ھ

جولائی ۲۰۲۰ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

شہادتِ حضرات عمر، عثمان و علی رضی اللہ عنہم

کا تاریخی پس منظر

فلسفۂ انقلاب کی روشنی میں

بانی تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جدید تعلیم یافتہ حضرات و خواتین کے لیے دینی علوم کے حصول کا نادر موقع

جاری کردہ: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

رجوع الی القرآن کورس

(دورانیہ ۹ ماہ)

عرصہ 38 سال سے باقاعدگی سے جاری تعلیمی سلسلہ

مضامینِ تدریس

پارٹ ۱ (سالِ اوّل) برائے مرد و خواتین

- تجوید و ناظرہ
- عربی گرامر (صرف و نحو)
- ترجمہ قرآن (مع تفسیری و لغوی توضیحات)
- دورہ ترجمہ قرآن
- قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی
- سیرت و شمائل النبی ﷺ
- مطالعۂ حدیث و اصطلاحاتِ حدیث
- فکرِ اقبال
- فقہ العبادات
- معاشیاتِ اسلام
- اضافی محاضرات

پارٹ ۲ (سالِ دوم) برائے مرد حضرات

- عربی زبان و ادب
- اصولِ تفسیر
- تفسیر القرآن
- اصولِ حدیث
- درسِ حدیث
- اصول الفقہ
- فقہ المعاملات
- عقیدہ (طحاویہ)
- اضافی محاضرات

آغاز 10 اگست 2020 (ان شاء اللہ)

ایامِ تدریس پیر تا جمعہ

نوٹ: بیرونِ لاہور رہائشی حضرات کے لیے ہاسٹل کی محدود سہولت موجود ہے۔ لہٰذا خواہشمند حضرات 8 اگست تک اپنی رجسٹریشن کروا لیں۔

اوقاتِ تدریس: صبح 8 بجے تا 12:30

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی خدماتِ قرآنی کا مرکز —— قرآن اکیڈمی

36-K ماڈل ٹاؤن لاہور

email:irts@tanzeem.org

www.tanzeem.org

زیرِ انتظام: مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

مزید تفصیلات کے لئے www.tanzeem.org

03161466611 - 04235869501-3

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد : 69

شمارہ : 7

ذوالقعدہ 1441ھ

جولائی 2020ء

فی شمارہ -/40

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

اندرون ملک	400 روپے
بھارت وبنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700، فون: 3-35869501
فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org
publications@tanzeem.org
ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 79-35473375 (042)

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال 5

بھارت: نظریاتی انحراف کے نتائج
اور پاکستان کے لیے سبق — ایوب بیگ مرزا

بیان القرآن 9

سورۃ الاحقاف — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکرہ و تبصرہ 35

شہادتِ حضرات عمر، عثمان و علی رضی اللہ عنہم کا تاریخی پس منظر — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مطالعہ قرآن حکیم 56

انقلابِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا اساسی منہج — شجاع الدین شیخ

افکار و آراء 67

رؤیتِ ہلال کا مسئلہ: بصری یا نظری؟ — انجینئر مختار فاروقی

آزادیٔ نسواں 81

لڑکیوں کی بغاوت: اسباب وعلاج (۳) — ابوکلیم مقصود الحسن فیضی

انوارِ ہدایت 95

توکّل کی حقیقت اور اس کی فضیلت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بھارت: نظریاتی انحراف کے نتائج
اور پاکستان کے لیے سبق

بڑا انسان بننا فطری خواہش بھی ہوسکتی ہے‘ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ دنیا میں جو بھی بڑے انسان گزرے ہیں‘ خواہ وہ مذہبی تھے یا غیر مذہبی‘ اُنہیں مختلف شعبوں میں یا کسی ایک شعبہ میں کوئی کارنامہ سرانجام دینے پر دنیا نے بڑا انسان کہا۔ ایسے انسان کی تمام تر کوشش اور جِدّوجُہد اپنے فرض اور اپنے مشن کے حوالے سے ہوتی ہے‘ منتہائے مقصود کسی مشن کی تکمیل ہوتی ہے‘ اُسے دنیا بتاتی ہے کہ وہ بڑا انسان ہے۔ وہ تو مشن کی لگن میں خود کو کھو چکا ہوتا ہے۔ یہ انسان تاریخ کا حصّہ بن جاتا ہے‘ اِسے پڑھا جاتا ہے‘ اس پر لکھا جاتا ہے۔ بعض انسان زندگی ہی میں یہ اعزاز حاصل کر لیتے ہیں‘ مگر اکثر بڑے لوگوں کو اپنی زندگی میں وہ عظمت حاصل نہیں ہوتی جس کے وہ حق دار ہوتے ہیں‘ لیکن مرنے کے بعد جب اُن کے کارنامے دنیا کے سامنے آتے ہیں تو وہ امر ہو جاتے ہیں۔ دنیا اُن کو یاد کرتی ہے‘ اُن کی مثالیں دیتی ہے۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر بعض لوگوں میں بڑا انسان بننے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اتنا بڑا دیکھنا اور دکھانا چاہتے ہیں جتنے بڑے وہ نہیں ہوتے۔ یہاں اِس بات کی وضاحت بلکہ اعتراف کی ضرورت ہے کہ ایسا ہرگز نہیں کہ وہ نالائق اور نکمّے ہوتے ہیں۔ وہ قابل ہوتے ہیں‘ وہ استعداد اور اہلیت بھی رکھتے ہیں‘ وہ محنتی بھی ہوتے ہیں‘ وہ اپنے مشن کے لیے جِدّوجُہد کرتے ہیں۔ گویا خون پسینہ ایک تو کرتے ہیں‘ لیکن ہدف اپنی ذات کی پروجیکشن اور مقصود ذاتی بڑائی اور منفرد نظر آنا ہوتا ہے۔ لہٰذا حصولِ مقصد کے لیے وہ ایڑیوں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کسی سیڑھی پر چڑھ کر خود نمائی چاہتے ہیں تاکہ اُن کا منفرد ہونا دنیا دیکھے۔

آج بڑا نظر آنے کے لیے میڈیا سے بڑی اور بہتر کوئی سیڑھی نہیں‘ وہ میڈیا کے ذریعے اپنی

زبردست پروجیکشن کراتے ہیں۔ البتہ ایسے لوگوں کو مزید دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے‘ یعنی مثبت اور منفی ذہنیت رکھنے والے لوگ۔ اِس کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ مثبت رویہ رکھنے والے اپنی ذات‘ برادری‘ جماعت یا قوم وملک کا فائدہ کر کے نام کمانا چاہتے ہیں۔ کسی کا نقصان یا کسی کا بُرا کرنا اُن کے پیشِ نظر نہیں ہوتا۔ وہ کسی کے خلاف قلب وذہن میں بغض کی پرورش کر کے نام کمانے یا بڑا بننے کی کوشش نہیں کرتے لیکن اس قبیل کے منفی ذہنیت کے لوگ اِس طرح بڑا نام کمانا چاہتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنے ذاتی‘ جماعتی یا قومی اور ملکی حریف سے کس طرح زندہ رہنے کا حق چھینا ہے۔ یہ کم ظرف لوگ ہوتے ہیں۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہلیت اور استعداد کے حوالے سے ان منفی ذہنیت کے لوگوں میں کمی بیشی ہو سکتی ہے‘ لیکن یہ مثبت سوچ رکھنے والے لوگوں سے زیادہ محنتی اور جِدّوجُہد کرنے والے ہوتے ہیں۔ اُنہیں مشن سے بہت لگن ہوتی ہے۔ اندر کا بغض اور حسد اُنہیں بڑھ چڑھ کر کام کرنے پر اُکساتا رہتا ہے۔

بھارت کے پردھان منتری نریندر مودی کو آپ اِن لوگوں میں شمار کر سکتے ہیں اور چاہیں تو سرفہرست اُن کا نام لکھ دیں۔ دیکھیں‘ چائے کا سٹال لگاتے لگاتے اگر کوئی شخص بھارت جیسے ملک کا وزیراعظم بن جاتا ہے‘ جس کی آبادی پونے دو ارب کے قریب ہے‘ تو آپ ایسے شخص کو محنتی اور لگن سے کام کرنے والا‘ انتہائی جِدّوجُہد کرنے والا اور اپنی ہٹ کا پکّا تو قرار دیں گے۔ سڑک کے کنارے کھوکھا لگا کر گرم چائے پی لو کی آوازیں لگانے والا اگر ایک بڑی ریاست کا وزیراعظم بن جاتا ہے تو ہمیں اُس کی ذہانت‘ محنت اور صلاحیت کا اعتراف تو کرنا ہوگا۔ مودی نے اقتدار اور اقتدارِ مطلق حاصل کرنے کے لیے مذہب کو exploit کیا‘ یہ غلط اور نقصان دہ تھا۔ اگرچہ جمہوری طرزِ حکومت میں لوگ ووٹ حاصل کرنے کے لیے ایسے exploit کرنے والے نعرے لگاتے ہیں‘ لیکن اقتدار میں آ کر اِن نعروں کی توڑ مروڑ کرتے ہیں کیونکہ یہ نعرے مکمل طور پر قابلِ عمل نہیں ہوتے۔ مثلاً پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو نے اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگایا۔ عوام میں روٹی‘ کپڑا‘ مکان کا نعرہ بہت مقبول ہوا‘ لیکن بعد میں ہوا کیا؟ لوگوں نے یہاں تک کہا کہ روٹی کی جگہ گولی‘ کپڑے کی جگہ کفن اور مکان کی جگہ قبر ملی۔ ہم اس بحث میں نہیں اُلجھتے کہ یہ اعتراض درست تھا یا غلط۔ اصل بات یہ ہے کہ سیاست دان ایسے نعرے ووٹ حاصل کرنے کے لیے لگاتے رہتے ہیں۔ نریندر مودی بھی محض ایک سیاست دان ہوتا اور بدطینت انسان نہ ہوتا تو کچھ باتیں ہندوؤں

کی‘ کچھ اقلیتوں کی مان کر اپنی حکومت اور عوام کی خوشحالی پر توجہ دیتا۔

بھارت سیکولرازم کا دعوے دار ہے۔ ہم اپنے قارئین کی ناراضی مول لے کر اِس سے آگے بڑھ کر بات کہنے کو تیار ہیں۔ مودی اگر علی الاعلان یہ کہہ دیتا کہ ہم بھارت کو ہندو ریاست بنائیں گے‘ لیکن اِس ریاست میں کسی اقلیت سے ذرّہ برابر زیادتی نہیں ہوگی‘ خاص طور پر بڑی اقلیت مسلمان اپنے آپ کو مکمل طور پر محفوظ و مامون سمجھیں‘ اُن کی مساجد محفوظ ہوں گی‘ ان کے دینی شعائر کا احترام ہوگا‘ وہ حلال کھائیں‘ چاہے بھیڑ یا گائے کھائیں ریاست کو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ ہندو گائے نہیں کھائیں گے لیکن مسلمان کو منع نہیں کریں گے اور مذہب کی بنیاد پر اُن سے کوئی امتیازی سلوک نہیں ہوگا۔ ایسے قوانین رائج کر کے اُن پر سختی سے عمل درآمد کروا کر وہ بھارت کو ہندو ریاست قرار دیتے تو اس پر مسلمانانِ پاکستان کا اعتراض دوقومی نظریہ کی نفی ہوتا‘ کیونکہ اگر ہمیں پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کا حق ہے تو بھارت کی ہندو اکثریت کو ہندو بھارت بنانے سے کیسے روکا جاسکتا ہے؟ لیکن نریندر مودی غلط راہ پر گامزن ہوگیا۔ وہ بھارت کو ایسی ہندو ریاست بنانے پر تُل گیا جس سے اقلیتوں اور خاص طور پر مسلمانوں کو ملیامیٹ کر دیا جائے گا۔ مودی کے ایک سینئر وزیر کا یہ بیان آن ریکارڈ ہے کہ ۲۰۲۱ء ختم ہونے سے پہلے تمام غیر ہندوؤں کا بھارت سے مکمل صفایا کر دیا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ انسانی نہیں‘ شیطانی ذہن کی بات ہے۔ یہ فساد فی الارض ہے۔ جہاں تک بھارت کی اقتصادی ترقی کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ بنیا کاروبار میں تیز اور ہوشیار ہوتا ہے اور مال بنانے کا ہنر جانتا ہے۔ لہٰذا بھارت کی اقتصادی صورتِ حال کم از کم حکومتی سطح پر کافی بہتر ہوئی۔ اُس کے زرمبادلہ کے ذخائر میں اضافہ ہوا تو اس نے اِس دولت سے بے شمار اسلحہ خریدا اور عسکری قوت بھی بن گیا۔ لیکن وہ یہ بھول گیا کہ جنگ اور عسکریت کا تعلق صرف اسلحہ سے نہیں ہوتا۔ مودی سرکار نے دن رات بھارت کے طاقتور بلکہ علاقے کی سپر قوت ہونے کے نعرے میڈیا پر لگانے شروع کر دیے۔ امریکہ اور اسرائیل کے اسلام دشمن میڈیا نے عالمی سپیکر پر بھارت کی طاقت کو گونج دی۔ ’’شائننگ انڈیا‘‘ کے نعروں سے خطے کے لوگوں کے کان پھٹنے لگے۔

طاقت کے اِس زعم میں فروری ۲۰۱۹ء میں پاکستان سے چھیڑ چھاڑ کی اور ایک سرجیکل سٹرائیک کا ڈراما رچایا اور دعویٰ کیا کہ ۳۵۰ دہشت گرد مار دیے گئے ہیں۔ بعد میں تحقیقات سے

ثابت ہوا کہ صرف ایک کوّا جان سے گیا تھا اور اُنیس درخت جلے تھے‘ لیکن اس چھیڑ چھاڑ میں بھارت کے دو جنگی طیارے پاکستان نے مار گرائے اور ایک پائلٹ کو زندہ گرفتار کر لیا۔ بھارت کو خاصی شرمندگی اور خجالت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے باوجود مودی کی رعونت اور تکبّر میں خاص فرق واقع نہ ہوا۔ امریکہ اور اسرائیل بھارت کو اِس لیے کھلا پلا رہے تھے اور اُس کے بے ہنگم جسم کی مالش اِس لیے کر رہے تھے کہ بھارت کو Containment of China کے حوالے سے میدان میں اُتاریں گے۔ علاوہ ازیں سی پیک اور BRI کے راستے میں بھارت دیوارِ چین بن جائے گا اور امریکہ آسانی سے اگلی صدی میں بھی سپریم پاور آف دی ورلڈ ہوگا۔ لیکن پہلے بھارت نے افغانستان میں فوج نہ بھیج کر بزدلی کا مظاہرہ کیا‘ جس سے امریکہ بہت مایوس ہوا۔ پھر لداخ میں چین کے ہاتھوں جس خوبصورتی کے ساتھ اُس کی پٹائی ہوئی اُس پر بھارتی میڈیا سٹپٹا رہا ہے کہ بھارتی سینا کے سورماؤں کے کارنامے وہ کیسے بیان کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ فرد ہو یا قوم یا ملک‘ جب کسی کو بانس پر چڑھا دیا جاتا ہے تو اُس کی قلابازیاں اسی طرح لگتی ہیں جیسے آج کل مودی اور اُس کے شائننگ انڈیا کی لگ رہی ہیں۔ یہ نریندر مودی کا طرزِ عمل ہی ہے کہ آج اس کے شائننگ انڈیا کی دھلائی ہو رہی ہے۔ اس میں پاکستان اور مسلمانانِ پاکستان کے لیے ایک سبق ہے۔ پنڈت نہرو جو ہماری نظر میں بھارت کے بانی کی حیثیت رکھتے تھے‘ آج بھارت اُن کے نظریہ سیکولرازم سے منحرف ہو کر ذلیل و خوار ہو رہا ہے‘ جبکہ بانیٔ پاکستان کا قول تھا: ’’ہم ایک اسلامی فلاحی ریاست بنا کر جدید دور میں اسلامی اخوّت اور مساوات کی مثال قائم کریں گے۔‘‘

ذرا سوچیے! کہ اگر ہندو آج ایک دُنیوی وعدہ کی خلاف ورزی پر ذلیل و خوار ہو رہا ہے تو کیا ہم نے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے جو وعدہ کیا تھا کہ تو ہمیں ایک خطۂ زمین عطا کر دے‘ ہم اُس پر تیرا دین نافذ کریں گے! کیا اس وعدہ خلافی پر ہم ذلت و رسوائی سے بچ سکیں گے؟ ابھی بھی وقت ہے۔ چاہیے کہ ہم فیصلہ کر لیں: دل یا شکم! اللہ مہلت دیتا ہے‘ لیکن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہیں!!

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ الاحقاف

آیات ۱ تا ۱۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

حٰمٓ ۝۱ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝۲ مَا خَلَقْنَا
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ۝۳ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا
تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ
شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ؕ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ
عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۴ وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَ هُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ
غٰفِلُوْنَ ۝۵ وَ اِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّ كَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ
كٰفِرِيْنَ ۝۶ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ
اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا
تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ؕ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ
الرَّحِيْمُ ۝۸ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَ مَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ
بِيْ وَ لَا بِكُمْ ؕ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ وَ مَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ
مُّبِيْنٌ ۝۹ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ كَفَرْتُمْ بِهٖ وَ
شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَ اسْتَكْبَرْتُمْ ؕ اِنَّ

اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۰ وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ؕ وَ اِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ
فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ۝۱۱ وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا
وَّ رَحْمَةً ؕ وَ هٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا ۖۗ وَ بُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۲ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ
اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۱۳ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ
الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۴

آیت ۱ ﴿حٰمٓ ۝۱﴾ ’’ح‘ م۔‘‘

آیت ۲ ﴿تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝۲﴾ ’’اِس کتاب کا اتارا جانا ہے اُس اللہ کی طرف سے جو زبردست‘ کمال حکمت والا ہے۔‘‘

قبل ازیں سورۃ الجاثیہ کی آیت ۲ کے ضمن میں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ سورۃ الجاثیہ اور سورۃ الاحقاف کے آغاز کی آیات مشترک ہیں۔

آیت ۳ ﴿مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ﴾ ’’اور ہم نے نہیں پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے مابین ہے مگر حق کے ساتھ‘‘

یہ ایک مستحکم نظام اور ایک بامقصد تخلیق ہے۔ ہم نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ سورۃ الدخان میں اس بارے میں یوں فرمایا گیا ہے: ﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝۳۸﴾ ’’اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے مابین ہے محض کھیل کے طور پر تو تخلیق نہیں فرمایا‘‘۔

﴿وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ﴾ ’’اور ایک اجل معین کے لیے‘‘

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ۝۳﴾ ’’اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ اعراض کر رہے ہیں اس سے جس سے انہیں خبردار کیا جا رہا ہے۔‘‘

اس جملے میں الفاظ کی ترتیب دراصل یوں ہے: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْرِضُوْنَ عَمَّآ اُنْذِرُوْا۔ لیکن ایک مخصوص صوتی آہنگ (rhythm) برقرار رکھنے کے لیے یہاں الفاظ میں تقدیم و تاخیر کی گئی ہے۔ میں ’’تعارفِ قرآن‘‘ پر اپنے لیکچرز میں قرآن کے صوتی آہنگ پر گفتگو کرتے ہوئے یہ وضاحت کر چکا ہوں کہ ہم معروف معنوں میں جسے شاعری کہتے ہیں قرآن ویسی شاعری تو نہیں

ہے لیکن ایک خاص آہنگ اور روانی کی وجہ سے قرآن کی آیات میں blank verse کا سا انداز پایا جاتا ہے اور جملوں میں الفاظ کی تقدیم و تاخیر ہو جاتی ہے۔ اور غالباً یہ قرآنی اسلوب ہی دنیا میں blank verse کے رواج کا باعث بنا ہے۔

آیت ۴ ﴿قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ مَّا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَرُوۡنِیۡ مَاذَا خَلَقُوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہیے کہ کبھی تم نے غور بھی کیا کہ جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، مجھے دکھاؤ تو سہی کہ انہوں نے کیا پیدا کیا ہے زمین میں؟''

﴿اَمۡ لَہُمۡ شِرۡکٌ فِی السَّمٰوٰتِ ؕ﴾ ''یا اُن کی کوئی شراکت ہے آسمانوں میں؟''

﴿اِیۡتُوۡنِیۡ بِکِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ ہٰذَاۤ اَوۡ اَثٰرَۃٍ مِّنۡ عِلۡمٍ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۴﴾﴾ ''لاؤ میرے پاس کوئی کتاب اس سے پہلے کی یا کوئی ایسی روایت جس کی بنیاد علم پر ہو اگر تم سچے ہو!''

اپنے ان معبودوں کے بارے میں مجھ سے کسی الہامی ثبوت یا علمی اور منطقی دلیل سے بات کرو۔

آیت ۵ ﴿وَمَنۡ اَضَلُّ مِمَّنۡ یَّدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَنۡ لَّا یَسۡتَجِیۡبُ لَہٗۤ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ﴾ ''اور اُس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ کے سوا اُسے پکارتا ہے جو اُس کو جواب ہی نہیں دے سکتا قیامت کے دن تک''

وہ نہ تو ان کی دعاؤں کو سن سکتے ہیں اور نہ قبول کر سکتے ہیں۔

﴿وَہُمۡ عَنۡ دُعَآئِہِمۡ غٰفِلُوۡنَ ﴿۵﴾﴾ ''اور وہ ان کی دعا سے غافل ہیں۔''

وہ ان کے پکارنے سے بے خبر ہیں۔ انہیں تو پتا ہی نہیں کہ کوئی ان سے دعا مانگ رہا ہے۔ مشرکین اللہ تعالیٰ کے سوا جن معبودوں کو پکارتے ہیں ان میں کچھ تو بے جان اور بے عقل مخلوقات ہیں۔ ان کا تو اپنے پکارنے والوں کی دعاؤں سے بے خبر ہونا ظاہر ہی ہے۔ ان کے علاوہ کچھ بزرگ انسانوں کو بھی پکارا جاتا ہے۔ وہ اللہ کے ہاں اس عالم میں ہیں کہ جہاں انسانی آوازیں ان تک نہیں پہنچتیں۔ فرض کیجیے ایک شخص کسی بڑے ولی اللہ کو اپنی مدد کے لیے پکار رہا ہے تو عِلِّیّین میں موجود اس کی روح کو کیا معلوم کہ دنیا میں اس کا کوئی معتقد اسے پکار رہا ہے۔

آیت ۶ ﴿وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ کَانُوۡا لَہُمۡ اَعۡدَآءً وَّکَانُوۡا بِعِبَادَتِہِمۡ کٰفِرِیۡنَ ﴿۶﴾﴾ ''اور جب لوگوں کو جمع کیا جائے گا تو وہ ان کے دشمن بن جائیں گے اور وہ ان کی عبادت

کے منکر ہوں گے۔''

قیامت کے دن وہ پیغمبر، وہ فرشتے اور وہ اولیاء اللہ جن کو لوگ مدد کے لیے پکارتے ہیں اور ان سے دعا کرتے ہیں، وہ اپنے ان ''عقیدت مندوں'' سے ناراضگی اور دشمنی کا اظہار کریں گے کہ انہوں نے اللہ کے سامنے انہیں شرمسار کیا کہ انہیں اللہ کا مدِمقابل ٹھہرایا۔ اس معاملے کی ''حساسیت'' کا اندازہ اس سے لگائیں کہ ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایسے الفاظ ادا کیے: مَا شَاءَ اللّٰهُ وَمَا شِئْتَ یعنی جو اللہ چاہے اور جو آپ ﷺ چاہیں! اس پر آپ ﷺ نے فوراً انہیں ٹوک دیا اور فرمایا: ((اَجَعَلْتَنِیْ لِلّٰهِ نِدًّا؟))[1] ''کیا تم نے مجھے اللہ کا مدِمقابل بنا دیا ہے؟'' کیونکہ مشیت تو صرف اور صرف اللہ کے لیے ہے۔

آیت ۷ ﴿وَاِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلۡحَقِّ لَمَّا جَآءَہُمۡ ۙ ہٰذَا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۷﴾﴾ ''اور جب انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں ہماری آیتِ بیّنات' تو یہ کافر کہتے ہیں حق کے بارے میں' جبکہ وہ ان کے پاس آ گیا' کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔''

آیت ۸ ﴿اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ ؕ﴾ ''کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے اس کو گھڑ لیا ہے؟''

کیا ان کا خیال ہے کہ محمد ﷺ نے قرآن کو خود تصنیف کیا ہے؟

﴿قُلۡ اِنِ افۡتَرَیۡتُہٗ فَلَا تَمۡلِکُوۡنَ لِیۡ مِنَ اللّٰہِ شَیۡئًا ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہیے کہ اگر میں نے اس کو گھڑ لیا ہے تو تم مجھے اللہ (کی پکڑ) سے ذرا بھی نہیں بچا سکتے۔''

سورۃ الحاقہ میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿وَلَوۡ تَقَوَّلَ عَلَیۡنَا بَعۡضَ الۡاَقَاوِیۡلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذۡنَا مِنۡہُ بِالۡیَمِیۡنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعۡنَا مِنۡہُ الۡوَتِیۡنَ ﴿۴۶﴾﴾ کہ اگر بالفرض محمد (ﷺ) کوئی چیز گھڑ کر ہماری طرف منسوب کر دیں تو ہم ان کا دایاں ہاتھ پکڑیں گے اور پھر ان کی رگِ جاں کو کاٹ دیں گے۔ ظاہر ہے اس اسلوب میں جو غصہ ہے وہ ان لوگوں پر ہے جو حضور ﷺ پر ایسا الزام لگانے کی جسارت کرتے تھے۔

﴿ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَا تُفِیۡضُوۡنَ فِیۡہِ ؕ﴾ ''وہ خوب جانتا ہے جن باتوں میں تم لگے

۱۔ ان الفاظ میں یہ حدیث علامہ محمد بن عبدالوہاب نے ''کتاب التوحید'' میں نسائی کے حوالے سے درج کی ہے۔ جبکہ مسند احمد میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ((أَجَعَلْتَنِیْ وَاللّٰهَ عَدْلًا؟)) ''کیا تو نے مجھے اور اللہ کو برابر کر دیا؟'' (مرتب)

ہوئے ہو۔‘‘

اللہ تعالیٰ تمہاری یہ گفتگو بھی سن رہا ہے اور وہ تمہارے دلوں میں چھپے ہوئے خیالات سے بھی آگاہ ہے۔

﴿کَفٰی بِہٖ شَہِیۡدًۢا بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکُمۡ ؕ وَ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ۸﴾ ’’وہ کافی ہے بطور گواہ میرے اور تمہارے مابین‘ اور وہ خوب بخشنے والا‘ بہت رحم فرمانے والا ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے میرے پاس وحی بھیجی ہے اور وہ خوب جانتا ہے کہ میں اس کا رسول ہوں۔

آیت ۹ ﴿قُلۡ مَا کُنۡتُ بِدۡعًا مِّنَ الرُّسُلِ﴾ ’’(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ان سے یہ بھی) کہیے کہ میں کوئی نیا رسول تو نہیں ہوں‘‘

بِدۡعًا کے معنی نیا نویلا یا نرالا ہونے کے ہیں۔ لفظ ’’بدعت‘‘ بھی اسی مادہ سے مشتق ہے۔ بدعت سے اصطلاحاً وہ چیز مراد ہے جو اصل میں دین کا حصہ نہ ہو بلکہ کسی وجہ سے دین میں رائج کر دی گئی ہو۔ بہرحال یہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہلوایا جا رہا ہے کہ میرا رسولؐ بن کر آنا کوئی نئی بات نہیں ہے‘ بلکہ میں تو آخری رسولؐ ہوں۔ بہت سے رسولؑ مجھ سے پہلے بھی دنیا میں آ چکے ہیں۔ سورۂ آلِ عمران میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے: ﴿وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِہِ الرُّسُلُ ؕ﴾ (آیت ۱۴۴) ’’اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں‘ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں‘‘۔ سورۃ المائدۃ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی بالکل یہی الفاظ آئے ہیں: ﴿مَا الۡمَسِیۡحُ ابۡنُ مَرۡیَمَ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِہِ الرُّسُلُ ؕ﴾ (آیت ۷۵) ’’مسیحؑ ابن مریم اور کچھ نہیں سوائے اس کے کہ وہ ایک رسولؑ تھے‘ انؑ سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے تھے۔‘‘

﴿وَ مَاۤ اَدۡرِیۡ مَا یُفۡعَلُ بِیۡ وَ لَا بِکُمۡ ؕ﴾ ’’اور مجھے یہ معلوم نہیں کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا اور نہ یہ کہ تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔‘‘

اس سے آخرت کا معاملہ مراد نہیں ہے‘ کیونکہ آخرت کے بارے میں تو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت واضح انداز میں بتا دیا گیا تھا: ﴿وَ لَلۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لَّکَ مِنَ الۡاُوۡلٰی ؕ۴﴾ (الضُّحٰی) یعنی آپؐ کے لیے آخرت یقیناً دنیا سے بہت بہتر ہو گی۔ بلکہ آیت زیر مطالعہ کا اشارہ اس کش مکش کی طرف ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مشرکینِ مکّہ کے درمیان مسلسل جاری تھی۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک اُمید لے کر طائف تشریف لے گئے تھے لیکن وہاں جو کچھ ہوا وہ آپؐ کی توقعات کے بالکل برعکس

تھا۔ نبوت کے دسویں سال جب جناب ابوطالب کا انتقال ہو گیا تو آپؐ کے اپنے قبیلے بنو ہاشم نے بھی آپؐ سے اظہارِ براءت کر دیا۔ اس کے بعد مکہ میں دُنیوی اعتبار سے آپؐ کا کوئی حلیف یا حمایتی نہ رہا۔ ان حالات میں آپؐ طائف تشریف لے گئے۔ آپؐ کا خیال تھا کہ اہلِ طائف میں سے اگر کوئی بڑا سردار ایمان لے آیا تو میں اپنی دعوت کا مرکز وہاں منتقل کر لوں گا۔ لیکن اہلِ طائف کا رویہ اہلِ مکّہ سے بھی بدتر نکلا۔ لہٰذا مکہ کے ماحول میں جاری کشیدگی کے حوالے سے یہاں آپؐ سے کہلوایا جا رہا ہے کہ اس چپقلش کے اندر آئندہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے کیا پیش آنے والا ہے اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہونے والا ہے مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔

﴿اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ وَ مَاۤ اَنَا اِلَّا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ۹﴾ ’’میں تو بس اُسی کی پیروی کر رہا ہوں جو میری طرف وحی کی جا رہی ہے‘ اور میں نہیں ہوں مگر ایک کھلا خبردار کر دینے والا۔‘‘

آیت ۱۰ ﴿قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ کَانَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ وَ کَفَرۡتُمۡ بِہٖ﴾ ’’(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) ان سے کہیے کہ کیا تم نے سوچا بھی ہے کہ اگر یہ (قرآن) واقعتاً اللہ کی طرف سے ہوا اور تم نے اس کا انکار کر دیا (تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا)؟‘‘

تم لوگ مجھے الزام دیتے ہو کہ میں نے یہ قرآن خود گھڑ لیا ہے‘ لیکن جب تمہیں چیلنج دیا گیا کہ اس جیسی کتاب تم بھی بنا کر دکھاؤ بلکہ ایک سورت ہی بنا لاؤ تو تم اس چیلنج کا جواب نہیں دے سکے‘ اس لیے دل سے تم بھی مانتے ہو کہ یہ کتاب انسانی تصنیف نہیں ہے۔ بہرحال اگر تم اسے اللہ کا کلام نہیں مانتے تو یہ بات اچھی طرح سے سوچ لو کہ اگر واقعتاً یہ اللہ ہی کا کلام ہوا تو تمہارے اس انکار کا کیا نتیجہ نکلے گا؟

﴿وَ شَہِدَ شَاہِدٌ مِّنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ عَلٰی مِثۡلِہٖ﴾ ’’اور گواہی دے چکا ہے ایک گواہ بنی اسرائیل میں سے ایک ایسی ہی کتاب کی۔‘‘

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کے مابین اختلاف ہے۔ اس بارے میں ایک رائے تو یہ ہے کہ اس سے عام اہلِ کتاب مؤمنین مراد ہیں‘ جبکہ کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے۔ بظاہر یہ دوسری رائے زیادہ معتبر معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ عہد نامہ قدیم‘ کتاب استثناء کے اٹھارہویں باب کی آیات ۱۸‘ ۱۹ میں جو پیشین گوئی درج ہے اس میں یہ الفاظ ہیں: ’’اے موسیٰؑ میں ان کے بھائیوں میں سے تیرے مثل ایک پیغمبر اٹھاؤں گا

اور اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا‘‘۔ ان الفاظ کے مطابق تو مثلہٖ کا یہی مفہوم واضح ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ ؑ کی مثل حضرت محمد ﷺ ہیں اور حضرت محمد ﷺ کی طرح حضرت موسیٰ ؑ ہیں۔ کیونکہ حضرت موسیٰ ؑ بھی صاحبِ شریعت رسول ہیں اور حضور ﷺ کو بھی قرآن کی شکل میں آخری اور کامل شریعت عطا کی گئی ہے۔ جبکہ حضرت عیسیٰ ؑ صاحبِ کتاب رسول تو ہیں لیکن صاحبِ شریعت نہیں ہیں۔ سورۃ الزخرف کی آیت ۶۳ میں حضرت عیسیٰ ؑ کا یہ قول ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿قَالَ قَدۡ جِئۡتُکُمۡ بِالۡحِکۡمَۃِ﴾ کہ میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں۔ سورۃ الزخرف کی اس آیت کے ضمن میں یہ وضاحت بھی گزر چکی ہے کہ انجیل میں احکام اور شریعت نہیں صرف حکمت ہے‘ جبکہ تورات اور قرآن قانون اور شریعت کی حامل کتابیں ہیں۔

﴿فَاٰمَنَ وَ اسۡتَکۡبَرۡتُمۡ ؕ﴾ ’’پس وہ تو ایمان لے آیا اور تم استکبار کر رہے ہو!‘‘

یہود میں ایسے علماء بھی تھے (اگرچہ ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی) جو نبی آخر الزماں ﷺ پر ایمان لے آئے تھے۔ جیسے حضرت عبداللہ بن سلام ؓ جو یہود کے بہت بڑے عالم تھے۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۰﴾﴾ ’’بے شک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔‘‘

آیت ۱۱ ﴿وَ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَوۡ کَانَ خَیۡرًا مَّا سَبَقُوۡنَاۤ اِلَیۡہِ ؕ﴾ ’’اور کہا ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کی روش اختیار کی‘ ان لوگوں کے بارے میں جو ایمان لائے کہ اگر یہ (قرآن) کوئی خیر ہوتا تو یہ لوگ اس کی طرف ہم سے سبقت نہ لے جاتے۔‘‘

یہ سردارانِ قریش کے موقف کا حوالہ ہے کہ ہم بڑے ہیں‘ دانشور ہیں اور ہر اعتبار سے معاشرے کے سرکردہ لوگ ہیں۔ جب ہم اس دین کی طرف مائل نہیں ہوئے اور ہمیں اس قرآن میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں بھلائی کی کوئی بات ہے ہی نہیں‘ ورنہ یہ غریب غرباء اور گھٹیا لوگ اس معاملے میں ہم سے سبقت حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ مکہ میں رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والوں میں اگرچہ حضرت عثمان بن عفان‘ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف‘ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر ؓ جیسے لوگ بھی تھے‘ جن کا تعلق اونچے گھرانوں سے تھا‘ مگر ابتدا میں زیادہ تر نادار اور مزدور لوگ ہی حضور ﷺ پر ایمان لائے تھے‘ جن میں کوئی غلام بھی تھے‘ اور شروع شروع میں یہی لوگ زیادہ تر آپؐ کے اردگرد موجود ہوتے تھے۔

چنانچہ جس طرح حضرت نوح ؑ کی قوم کے سرداروں کو اعتراض تھا کہ آپؑ کے پیروکار نچلے طبقے کے لوگ ہیں (ہود: ۲۲) اسی طرح مکہ کے سرداروں کو بھی نادار اور غلام اہلِ ایمان کی

موجودگی میں حضور ﷺ کی محفل میں بیٹھنا گوارا نہیں تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان مزدوروں‘ غلاموں اور کمتر حیثیت کے لوگوں کے درمیان آ کر بیٹھنا ہمارے شایانِ شان نہیں۔ ہاں ان لوگوں کو اگر آپؐ اپنی محفل سے اٹھا دیں تو پھر ہم آپؐ کے پاس آ کر آپؐ کی بات سننے پر غور کر سکتے ہیں۔ اس حوالے سے سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ نے ان مؤمنین صادقین کے بارے میں حضور ﷺ سے فرمایا: ﴿وَ لَا تَطۡرُدِ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَ الۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَہٗ ؕ مَا عَلَیۡکَ مِنۡ حِسَابِہِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ وَّ مَا مِنۡ حِسَابِکَ عَلَیۡہِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَتَطۡرُدَہُمۡ فَتَکُوۡنَ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵۲﴾﴾ ’’اور مت دھتکاریئے آپؐ ان لوگوں کو جو پکارتے ہیں اپنے ربّ کو صبح و شام اور اُس کی رضا کے طالب ہیں۔ آپؐ کے ذمے ان کے حساب میں سے کچھ نہیں ہے اور نہ آپؐ کے حساب میں سے ان کے ذمے کچھ ہے‘ تو اگر (بالفرض) آپؐ انہیں دور کریں گے تو آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔‘‘

﴿وَ اِذۡ لَمۡ یَہۡتَدُوۡا بِہٖ فَسَیَقُوۡلُوۡنَ ہٰذَاۤ اِفۡکٌ قَدِیۡمٌ ﴿۱۱﴾﴾ ’’اور چونکہ انہوں نے اس (قرآن) کے ذریعے سے ہدایت نہیں پائی تو اب کہیں گے کہ یہ تو گھڑی ہوئی پرانی چیز ہے۔‘‘

آیت ۱۲ ﴿وَ مِنۡ قَبۡلِہٖ کِتٰبُ مُوۡسٰۤی اِمَامًا وَّ رَحۡمَۃً ؕ﴾ ’’حالانکہ اس سے پہلے موسیٰؑ کی کتاب موجود ہے‘ راہنمائی کرنے والی اور رحمت!‘‘

﴿وَ ہٰذَا کِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِیًّا﴾ ’’اور یہ کتاب اس کی تصدیق کرنے والی ہے‘ عربی زبان میں‘‘

یعنی قرآن مصدق ہے تورات اور انجیل کا‘ اور قرآن کی یہ تصدیق دو پہلو سے ہے۔ ایک طرف تو قرآن ان کتابوں کی اس لحاظ سے تصدیق کرتا ہے کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہیں۔ یہ تصدیق ہمیں قرآن میں جابجا ملتی ہے۔ مثلاً سورۃ المائدۃ (آیت ۴۴) میں فرمایا: ﴿اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىۃَ فِیۡہَا ہُدًی وَّ نُوۡرٌ ۚ﴾ کہ ہم نے تورات نازل کی تھی اس میں ہدایت بھی تھی اور نور بھی تھا۔ اور پھر سورۃ المائدۃ میں ہی آگے آیت ۴۶ میں انجیل کی تصدیق ہے: ﴿وَ اٰتَیۡنٰہُ الۡاِنۡجِیۡلَ فِیۡہِ ہُدًی وَّ نُوۡرٌ﴾ کہ ہم نے عیسیٰؑ ابن مریم کو انجیل عطا کی‘ یہ بھی ہدایت اور نور کا منبع ہے۔ چنانچہ قرآن ایک تو ان دونوں کتابوں کے منزّل من اللہ ہونے کی تصدیق کرتا ہے (اگرچہ ان دونوں میں تحریف کر دی گئی) جبکہ اس تصدیق کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ تورات اور انجیل میں جو پیشین گوئیاں تھیں قرآن ان کا مصداق بن کر آیا ہے۔

﴿لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ﴾ ''تا کہ خبردار کر دے ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کی روش اختیار کی''

خبردار اور متنبہ کر دینے کی ذمہ داری ہی کی وجہ سے قرآن کو سادہ اور سلیس زبان میں نازل کیا گیا اور سمجھنے کے لیے آسان بنا دیا گیا تا کہ ہر شخص تک اس کا پیغام پہنچ جائے۔

﴿وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٢﴾﴾ ''اور بشارت بن جائے احسان کی روش اختیار کرنے والوں کے لیے۔''

''محسنین'' وہ لوگ ہیں جو اسلام کے درجے سے بتدریج آگے بڑھتے ہوئے ایمان اور پھر احسان کے درجے تک پہنچ جائیں۔

آیت ۱۳ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ ''بے شک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر جم گئے''

نوٹ کیجیے یہ وہی الفاظ ہیں جو اس سے پہلے ہم سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی آیت ۳۰ میں پڑھ آئے ہیں۔ وہاں بھی میں نے عرض کیا تھا اور اب پھر دہرا رہا ہوں کہ اس ''استقامت'' کو صرف ایک لفظ مت سمجھئے' غور کریں گے تو آپ کو محسوس ہو گا کہ اس ''استقامت'' میں ایک ''قیامت'' مضمر ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مان کر ہر حال میں اس کی رضا پر راضی رہنا' اس کی رضا کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لینا' اسی پر توکل کرنا' اس کے احکامات کی پابندی کرنا اور اس کی طرف سے عائد کردہ جملہ ذمہ داریوں کو نبھانے میں اپنا تن من دھن داؤ پر لگا دینا وغیرہ سب اس استقامت میں شامل ہے۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ (آیت ۳۰) کے مطالعہ کے دوران ہم حضرت سفیان بن عبداللہ ؓ کی حدیث پڑھ چکے ہیں کہ انہوں نے حضور ﷺ سے درخواست کی تھی کہ مجھے اسلام کے بارے میں کوئی ایک بات ایسی بتا دیجیے جسے میں پلّے باندھ لوں اور میرے لیے وہ کافی ہو جائے۔ اس کے جواب میں حضور ﷺ نے فرمایا: ((قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ)) ''کہو کہ میں ایمان لایا اللہ پر' پھر اس پر جم جاؤ!'' بہر حال اللہ پر ایمان لانے کے بعد استقامت یہی ہے کہ انسان کا دل اس سوچ پر جم جائے کہ اللہ ہی میرا پروردگار ہے اور وہی حاجت روا' وہی مشکل کشا ہے اور وہی میری دعاؤں کا سننے والا ہے' اور پھر انسان خود کو اللہ کے لیے وقف کر دے۔ ایک بندۂ مؤمن کی اسی کیفیت کا نقشہ سورۃ الانعام کی اس آیت میں دکھایا گیا ہے: ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦٢﴾﴾ ''آپ کہیے: میری نماز' میری قربانی'

میری زندگی اور میری موت اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔''

﴿فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿١٣﴾﴾ ''تو ان پر نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ حزن سے دوچار ہوں گے۔''

ملاحظہ کیجیے سورۂ یونس کی آیت ۶۲ میں ''اولیاء اللہ'' کے مخصوص مقام و مرتبہ کے حوالے سے بھی بالکل یہی الفاظ آئے ہیں: ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾﴾ ''آگاہ ہو جاؤ! اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔ گویا جو لوگ ایمان لائے اور پھر ایمان پر مستقیم ہو گئے وہ اولیاء اللہ ہیں اور آخرت میں انہیں کسی قسم کے خوف اور حزن وملال کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

آیت ۱۴ ﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٤﴾﴾ ''یہی لوگ جنت والے ہیں' اس میں ہمیشہ رہنے والے۔ یہ جزا ہو گی ان اعمال کی جو وہ کرتے رہے۔''

جیسا کہ پہلے بھی کئی مرتبہ ذکر ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی قدر افزائی کے لیے جنت میں داخلے اور اس کی نعمتوں کو ان کے اعمال کا صلہ قرار دیتا ہے' جبکہ اللہ کے یہ نیک بندے جنت میں پہنچ کر اللہ کا شکر کرتے ہوئے اعتراف کریں گے کہ یہ سب کچھ اللہ کے فضل کے سبب ہی ممکن ہوا' اور یہ کہ وہ اپنے اعمال کے بل بوتے پر یہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتے تھے: ﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۣ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾ (الاعراف: ۴۳) ''اور وہ کہیں گے کُل شکر اور کُل تعریف اُس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں یہاں تک پہنچایا' اور ہم خود سے یہاں تک نہیں پہنچ سکتے تھے اگر اللہ ہی نے ہمیں نہ پہنچا دیا ہوتا۔''

بہر حال یہ اللہ کا اپنے بندوں پر بے پایاں فضل ہے کہ وہ قرآن میں بار بار ان کے نیک اعمال کی قدر دانی فرماتا ہے کہ اگر تم لوگوں نے: ﴿اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴿٣﴾﴾ (الدھر) کے اختیار کے باوجود میرے شکر گزار بندے بن کر زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا اور اس پر مشقتیں اور تکلیفیں برداشت کیں' چنانچہ میں نے بھی تمہاری مدد کرتے ہوئے اس راستے پر تمہارے لیے آسانیاں پیدا کر دیں' تمہیں آگے بڑھنے کی توفیق عطا کی اور آج میں تمہارے ان اعمال کا بدلہ تمہیں جنت کی ابدی اور دائمی نعمتوں کی صورت میں عطا کر رہا ہوں۔

آیات ۱۵ تا ۲۰

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ۭ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ
كُرْهًا ۭ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ۭ حَتّٰٓي اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ
بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ
اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ
فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ اِنِّىْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۱۵ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ
نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ
الْجَنَّةِ ۭ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ۝۱۶ وَالَّذِيْ قَالَ
لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدٰنِنِيْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ
قَبْلِيْ ۚ وَهُمَا يَسْتَغِيْثٰنِ اللّٰهَ وَيْلَكَ اٰمِنْ ڰ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ښ
فَيَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۷ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ حَقَّ
عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۭ
اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ۝۱۸ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ
اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝۱۹ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَي
النَّارِ ۭ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ
تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ
وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ۝۲۰ۧ

آیت ۱۵ ﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ۭ﴾ ’’اور ہم نے تاکید کی انسان کو اُس کے والدین کے بارے میں حسنِ سلوک کی۔‘‘

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کے احکام قرآن میں بہت تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کے اس حکم میں اس حوالے سے خصوصی تاکید پائی جاتی ہے:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰـهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ

لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝۲۳﴾ ’’اور فیصلہ کر دیا ہے آپؐ کے رب نے کہ تم نہیں عبادت کرو گے کسی کی سوائے اُس کے اور والدین کے ساتھ احسان (کرو گے)۔ اگر پہنچ جائیں تمہارے پاس بڑھاپے کو ان میں سے کوئی ایک یا دونوں‘ تو مت کہو ان کو اُف بھی اور مت جھڑکو ان کو‘ اور بات کرو ان سے نرمی کے ساتھ۔‘‘

اولاد کے لیے اگرچہ والد اور والدہ دونوں قابلِ احترام ہیں اور دونوں ہی ان کے حسنِ سلوک کے مستحق ہیں لیکن بچے کی پیدائش اور پرورش میں ماں کی مشقت اور ذمہ داری چونکہ زیادہ ہے اس لیے اولاد کی طرف سے خدمت اور حسنِ سلوک کے حوالے سے اس کا حق بھی فائق ہے۔ چنانچہ سورۂ لقمان میں ماں کے خصوصی حق کا ذکر یوں فرمایا گیا: ﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰي وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ﴾ ’’اور ہم نے وصیت کی انسان کو اس کے والدین کے بارے میں‘ اس کو اٹھائے رکھا اس کی ماں نے (اپنے پیٹ میں) کمزوری پر کمزوری جھیل کر‘ پھر اس کا دودھ چھڑانا ہوا دو سال میں۔‘‘

والدہ کے خصوصی حق کی وضاحت ایک حدیث میں بھی ملتی ہے۔ ایک صحابیؓ نے حضورﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا: یارسول اللہ! میرے حسنِ سلوک کا سب سے بڑھ کر مستحق کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ’’تمہاری والدہ!‘‘ انہوںؓ نے پھر پوچھا کہ اس کے بعد کون؟ آپؐ نے فرمایا: ’’پھر تمہاری والدہ!‘‘ یہ سوال انہوں نے چار مرتبہ دہرایا۔ جواب میں آپؐ نے تین مرتبہ فرمایا: تمہاری والدہ۔ جبکہ چوتھی مرتبہ آپؐ نے فرمایا: ’’پھر تمہارا والد!‘‘(۲) البتہ اس حوالے سے یہ نکتہ مدنظر رہنا چاہیے کہ والدہ کے حق کی یہ فوقیت اخلاقی اعتبار سے ہے جبکہ قانونی طور پر والد کا حق ہی فائق ہے۔ مثلاً اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ جنت ماں کے قدموں میں ہے: ((اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّهَاتِ))(۳) لیکن اگر میاں بیوی میں علیحدگی ہو جائے تو اسلامی قانون اولاد پر والد ہی کا حق تسلیم کرتا ہے۔

﴿حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۭ﴾ ’’اس کی ماں نے اسے اٹھائے رکھا (پیٹ میں) تکلیف جھیل کر اور اسے جنا تکلیف کے ساتھ۔‘‘

۲۔ صحیح البخاری‘ کتاب الادب‘ باب من احق الناس بحسن الصحبۃ۔ وصحیح مسلم‘ کتاب البر والصلۃ والآداب‘ باب بر الوالدین...

۳۔ الجامع الصغیر للسیوطی‘ ح: ۳۶۴۲۔ راوی: انس بن مالکؓ۔

﴿وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ﴾ ’’اور اس کا یہ حمل اور دودھ چھڑانا ہے (لگ بھگ) تیس مہینے میں۔‘‘

ان دو جملوں میں ان تمام اضافی تکالیف اور مشقتوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے جو والد کے مقابلے میں صرف والدہ کو برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ بچے کی پیدائش اور پرورش میں والد بالواسطہ طور پر حصہ لیتا ہے جبکہ والدہ اس پورے عمل میں براہِ راست کردار ادا کرتی ہے۔ دورانِ حمل کی گونا گوں پریشانیوں‘ وضع حمل کی جان لیوا تکلیفوں اور رضاعت و پرورش کی صبر آزما مشقتوں کو وہ تن تنہا جھیلتی ہے۔

﴿حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ﴾ ’’یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری قوت کو پہنچتا ہے اور چالیس برس کا ہو جاتا ہے‘‘

بچے کی جسمانی بلوغت تو سولہ سترہ سال کی عمر میں ہو جاتی ہے‘ لیکن یہاں ذہنی اور نفسیاتی بلوغت اور پختگی کا ذکر ہوا ہے اور اس کی کم از کم حد چالیس سال بتائی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو چالیس برس کی عمر میں منصبِ نبوت پر فائز کیا جاتا رہا ہے‘ جیسا کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نبوت چالیس برس کی عمر میں ملی۔ البتہ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق کچھ استثناء کی مثالیں بھی ہیں۔ مثلاً حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بچپن میں ہی حکمت عطا کر دی گئی تھی‘ جیسا کہ سورۂ مریم کی اس آیت سے واضح ہے: ﴿وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ﴿١٢﴾﴾ ’’اور ہم نے اسے عطا کر دی حکمت و دانائی بچپن میں ہی‘‘۔ اور ایسا ہی معاملہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی تھا۔ لیکن عام قاعدہ کے تحت ذہنی و نفسیاتی بلوغت (maturity) کی حد چالیس سال ہی ہے۔ اور اس حوالے سے آیت زیر مطالعہ میں ایک بچے کی مثال دی گئی ہے کہ جب وہ اپنی زندگی کے ابتدائی مراحل طے کر کے چالیس برس کی عمر میں ذہنی پختگی کو پہنچ جاتا ہے تو:

﴿قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ﴾ ’’وہ کہتا ہے: اے میرے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں شکر کر سکوں تیرے انعامات کا جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر فرمائے۔‘‘

﴿وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ﴾ ’’اور یہ کہ میں ایسے اعمال کروں جنہیں تو پسند کرے اور میرے لیے میری اولاد میں بھی اصلاح فرما دے۔‘‘

اس دعا کا اسلوب خصوصی طور پر لائق توجہ ہے۔ دعا صرف یہ نہیں کہ میری اولاد کی اصلاح

فرما دے اور انہیں نیک بنا دے‘ بلکہ الفاظ کے مفہوم کی اصل روح یہ ہے کہ میری نسل میں میرے لیے اصلاح فرما دے‘ ان میں میرے لیے بہتری پیدا فرما دے۔ اس لیے کہ بچے اگر صالح اور نیک ہوں گے تو اپنے والدین کے لیے مغفرت کی دعا کریں گے۔ اگر والدین نے اولاد کی اچھی تربیت کی ہو گی تو ان کے نیک اعمال میں سے والدین کو بھی صدقہ جاریہ کے طور پر حصہ ملتا رہے گا۔ یوں اولاد کی بہتری اور اصلاح گویا والدین کے لیے بھی فائدہ مند ہو گی۔ بالکل یہی مفہوم اس دعا کا بھی ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿٧٤﴾﴾ (الفرقان) ’’اور وہ لوگ کہ جو کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہمیں ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما‘ اور ہمیں متقیوں کا امام بنا۔‘‘

﴿اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿١٥﴾﴾ ’’میں تیری جناب میں توبہ کرتا ہوں اور یقیناً میں (تیرے) فرمانبرداروں میں سے ہوں۔‘‘

آیت ۱۶ ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْۤ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ؕ﴾ ’’یہ وہ لوگ ہیں جن سے ہم ان کے بہترین اعمال قبول فرمائیں گے اور ہم ان کی خطاؤں سے بھی درگزر فرمائیں گے (اور وہ ہوں گے) جنت والوں میں سے۔‘‘

﴿وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿١٦﴾﴾ ’’یہ وہ سچا وعدہ ہے جو ان سے کیا جاتا تھا۔‘‘

ان آیات میں ایک ایسے شخص کے کردار کی تصویر دکھائی گئی ہے جو اپنے والدین کا نیک اور صالح بیٹا ہے۔ شعور کی پختگی کو پہنچتے پہنچتے اس کے دل و دماغ میں خیالات و نظریات کا جو ہیولا تیار ہوا ہے اس کا خوبصورت عکس اوپر آیت ۱۵ کے دعائیہ الفاظ سے جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد آئندہ آیات میں جس کردار کی تصویر دکھائی جا رہی ہے وہ اس کے برعکس ہے۔

آیت ۱۷ ﴿وَالَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَاۤ اَتَعِدٰنِنِيْۤ اَنْ اُخْرَجَ﴾ ’’اور ایک وہ شخص ہے جو اپنے والدین سے کہتا ہے کہ میں بیزار ہوں آپ دونوں سے‘ کیا آپ مجھے اس سے ڈراتے ہیں کہ میں نکال کھڑا کیا جاؤں گا (زندہ کر کے قبر سے)؟‘‘

والدین مسلمان ہیں‘ نیک سیرت ہیں‘ لیکن بیٹا آوارہ اور ذہنی طور پر گمراہ ہو چکا ہے۔ وہ نہ اللہ کو مانتا ہے‘ نہ آخرت پر یقین رکھتا ہے۔ وہ اپنے والدین سے تو تکار کرتا ہے کہ یہ آپ مجھے کیا ہر

وقت حساب کتاب کی دھمکیاں دیتے رہتے ہیں! تُف ہے آپ لوگوں پر! میں آپ کے ان ڈھکوسلوں کی خود ساختہ تفصیلات سن سن کر تنگ آ گیا ہوں! بس آپ لوگ مجھے مزید سمجھانا چھوڑ دیں! میں کسی آخرت واخرت کو نہیں مانتا!

﴿وَقَدۡ خَلَتِ الۡقُرُوۡنُ مِنۡ قَبۡلِیۡ ۚ﴾ ’’حالانکہ مجھ سے پہلے کتنی ہی نسلیں گزر چکی ہیں!‘‘

اب تک نسل در نسل کروڑوں‘ اربوں لوگ اس دنیا میں آئے اور چلے گئے۔ اُن میں سے تو آج تک کوئی اُٹھ کر نہ آیا۔ ایک وقت میں ان سب کا زندہ ہونا اور پھر ایک ایک کا حساب کتاب ہونا بالکل بعید از قیاس ہے۔ میں ایسی دقیانوسی باتوں کو ماننے والا نہیں ہوں۔

﴿وَہُمَا یَسۡتَغِیۡثٰنِ اللّٰہَ وَیۡلَکَ اٰمِنۡ ٭ۖ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ ۚ﴾ ’’اور وہ دونوں اللہ کی دہائی دے کر کہتے ہیں: بربادی ہو تیری‘ ایمان لے آ! یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے۔‘‘

﴿فَیَقُوۡلُ مَا ہٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۱۷﴾﴾ ’’لیکن وہ کہتا ہے: یہ کچھ نہیں مگر پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔‘‘

یہ دوبارہ زندہ ہونے اور آخرت کی باتیں بس فرضی کہانیاں ہیں جو پچھلے زمانے سے سینہ بہ سینہ نقل ہوتی چلی آرہی ہیں۔

آیت ۱۸ ﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ حَقَّ عَلَیۡہِمُ الۡقَوۡلُ﴾ ’’یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی بات صادق آئی‘‘

یعنی ایسے لوگ اللہ کے کلمۂ عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں۔

﴿فِیۡۤ اُمَمٍ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّنَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ ؕ﴾ ’’(یہ بھی شامل کر دیے جائیں گے) ان قوموں میں جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں جنوں اور انسانوں میں سے۔‘‘

﴿اِنَّہُمۡ کَانُوۡا خٰسِرِیۡنَ ﴿۱۸﴾﴾ ’’یقیناً یہی لوگ ہیں خسارے والے۔‘‘

آیت ۱۹ ﴿وَلِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوۡا ۚ﴾ ’’اور ہر ایک کے لیے درجے (اور مقامات) ہوں گے ان کے اعمال کے اعتبار سے۔‘‘

﴿وَلِیُوَفِّیَہُمۡ اَعۡمَالَہُمۡ وَہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۱۹﴾﴾ ’’اور تاکہ وہ پورا پورا دے انہیں ان کے اعمال کا بدلہ اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔‘‘

آیت ۲۰ ﴿وَیَوۡمَ یُعۡرَضُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا عَلَی النَّارِ ؕ﴾ ’’اور جس دن یہ کافر پیش کیے جائیں گے آگ پر۔‘‘

﴿اَذۡہَبۡتُمۡ طَیِّبٰتِکُمۡ فِیۡ حَیَاتِکُمُ الدُّنۡیَا وَاسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِہَا ۚ﴾ ’’(اُس وقت ان سے کہا جائے گا:) تم اپنے حصے کی اچھی چیزیں اپنی دنیا کی زندگی میں لے چکے اور ان سے تم نے خوب فائدہ اٹھالیا۔‘‘

تم دنیا میں خوب عیش کر چکے ہو‘ حلال و حرام کی تمیز سے بالاتر ہو کر تم نے وہاں بہت مزے اڑائے ہیں۔

﴿فَالۡیَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ عَذَابَ الۡہُوۡنِ بِمَا کُنۡتُمۡ تَسۡتَکۡبِرُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ وَبِمَا کُنۡتُمۡ تَفۡسُقُوۡنَ ﴿۲۰﴾﴾ ’’تو آج تمہیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا بسبب اس تکبر کے جو تم زمین میں ناحق کرتے رہے ہو اور بسبب ان نافرمانیوں کے جو تم کرتے رہے ہو۔‘‘

آیات ۲۱ تا ۲۸

وَ اذۡکُرۡ اَخَا عَادٍ ؕ اِذۡ اَنۡذَرَ قَوۡمَہٗ بِالۡاَحۡقَافِ وَ قَدۡ خَلَتِ النُّذُرُ
مِنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ وَ مِنۡ خَلۡفِہٖۤ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰہَ ؕ اِنِّیۡۤ اَخَافُ
عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۲۱﴾ قَالُوۡۤا اَجِئۡتَنَا لِتَاۡفِکَنَا عَنۡ اٰلِہَتِنَا ۚ
فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۲۲﴾ قَالَ اِنَّمَا الۡعِلۡمُ عِنۡدَ
اللّٰہِ ۫ۖ وَ اُبَلِّغُکُمۡ مَّاۤ اُرۡسِلۡتُ بِہٖ وَلٰکِنِّیۡۤ اَرٰىکُمۡ قَوۡمًا تَجۡہَلُوۡنَ ﴿۲۳﴾
فَلَمَّا رَاَوۡہُ عَارِضًا مُّسۡتَقۡبِلَ اَوۡدِیَتِہِمۡ ۙ قَالُوۡا ہٰذَا عَارِضٌ
مُّمۡطِرُنَا ؕ بَلۡ ہُوَ مَا اسۡتَعۡجَلۡتُمۡ بِہٖ ؕ رِیۡحٌ فِیۡہَا عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿ۙ۲۴﴾
تُدَمِّرُ کُلَّ شَیۡءٍۭ بِاَمۡرِ رَبِّہَا فَاَصۡبَحُوۡا لَا یُرٰۤی اِلَّا مَسٰکِنُہُمۡ ؕ
کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡقَوۡمَ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۲۵﴾ وَلَقَدۡ مَکَّنّٰہُمۡ فِیۡمَاۤ اِنۡ مَّکَّنّٰکُمۡ
فِیۡہِ وَ جَعَلۡنَا لَہُمۡ سَمۡعًا وَّ اَبۡصَارًا وَّ اَفۡـِٕدَۃً ۫ۖ فَمَاۤ اَغۡنٰی عَنۡہُمۡ
سَمۡعُہُمۡ وَلَاۤ اَبۡصَارُہُمۡ وَ لَاۤ اَفۡـِٕدَتُہُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِذۡ کَانُوۡا
یَجۡحَدُوۡنَ ۙ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَ حَاقَ بِہِمۡ مَّا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ﴿٪۲۶﴾ وَ

لَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَ صَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ
يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَوْ لَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا
اٰلِهَةً ؕ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَ ذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَ مَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۸﴾

آیت ۲۱ ﴿وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ ؕ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ﴾ ’’اور ذرا تذکرہ کیجیے قومِ عاد کے بھائی (ہودؑ) کا‘ جب اُس نے خبردار کیا اپنی قوم کو احقاف میں‘‘

جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی ساحلی علاقے کو پرانے زمانے میں ’’احقاف‘‘ کہا جاتا تھا جہاں قومِ عاد آباد تھی‘ اب یہ علاقہ لق ودق صحرا کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

﴿وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖٓ﴾ ’’اور اس سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی بہت سے خبردار کرنے والے گزر چکے تھے‘‘

یعنی ایسے خبردار کرنے والے اُس سے پہلے بھی گزر چکے تھے اور اس کے بعد بھی آتے رہے۔۔۔ اللہ تعالیٰ کی اس سنت کے بارے میں قبل ازیں بھی کئی مرتبہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ کسی قوم میں پہلے بہت سے انبیاء علیہم السلام بھیجے جاتے تھے اور پھر آخر میں اتمامِ حجت کے لیے ایک رسول کو مبعوث کیا جاتا تھا۔ وہ سب کے سب ایک ہی دعوت دیتے تھے۔

﴿اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ﴾ ’’کہ مت عبادت کرو کسی کی سوائے اللہ کے!‘‘

﴿اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۲۱﴾﴾ ’’مجھے اندیشہ ہے تم پر ایک بڑے دن کے عذاب کا۔‘‘

آیت ۲۲ ﴿قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ﴾ ’’انہوں نے کہا: کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہمیں بہکا کر ہمارے معبودوں سے برگشتہ کر دو؟‘‘

﴿فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۲﴾﴾ ’’تو جس عذاب کی دھمکی تم ہمیں دے رہے ہو وہ ہم پر لے آؤ اگر تم سچوں میں سے ہو!‘‘

آیت ۲۳ ﴿قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ﴾ ’’اس نے کہا کہ اس کا علم تو اللہ کے پاس ہے‘‘

یعنی عذاب کے بارے میں تو اللہ ہی جانتا ہے کہ اگر آئے گا تو کب آئے گا اور کس صورت میں آئے گا۔ مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں۔

﴿وَاُبَلِّغُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ﴾ ’’اور میں تو تمہیں پہنچا رہا ہوں وہ پیغام جو اُس نے

مجھے دے کر بھیجا ہے‘‘

میری ذمہ داری تو صرف اللہ کا پیغام تم لوگوں تک واضح طور پر پہنچا دینے اور اس کے مطابق تمہیں خبردار کر دینے کی حد تک ہے۔

﴿وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۳﴾﴾ ’’لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ بالکل جہالت کی روش اختیار کر رہے ہو۔‘‘

یہ تمہاری جہالت کی انتہا ہے کہ میری یہ باتیں سننے اور ان پر غور کرنے کے بجائے بغیر سوچے سمجھے تم ان کی نفی کرنے پر تُل گئے ہو۔

آیت ۲۴ ﴿فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ﴾ ’’پھر جب انہوں نے اس (عذاب) کو دیکھا بادل کی صورت میں اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے ہوئے‘‘

﴿قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ؕ﴾ ’’تو انہوں نے کہا: یہ تو بادل ہے جو ہم کو سیراب کرنے والا ہے۔‘‘

وہ اسے دیکھ کر خوشیاں منانے لگے کہ ابھی بارش ہو گی اور جل تھل ایک ہو جائیں گے۔

﴿بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ؕ﴾ ’’نہیں! بلکہ یہ تو وہ شے ہے جس کے بارے میں تم نے جلدی مچا رکھی تھی!‘‘

تم لوگ خود ہی کہتے تھے نا کہ لے آؤ ہم پر عذاب اگر لا سکتے ہو‘ تو دیکھ لو:

﴿رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۴﴾﴾ ’’یہ وہ جھکڑ ہے جس میں بہت دردناک عذاب ہے۔‘‘

اس تیز ہوا کے جھکڑ کی کیفیت سورۃ الحاقہ میں اس طرح بیان ہوئی ہے: ﴿سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ﴿۷﴾﴾ ’’اللہ نے مسلّط کیے رکھا اسے ان پر سات راتیں اور آٹھ دن‘ نیست و نابود کر دینے کے لیے‘ پس تم دیکھتے اس قوم کو اس میں پچھڑے ہوئے جیسے وہ گری ہوئی کھجوروں کے تنے ہوں۔‘‘

آیت ۲۵ ﴿تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا﴾ ’’تباہ و برباد کرتا ہے ہر شے کو اپنے رب کے حکم سے‘‘

دمر کے مادہ میں کسی درخت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ چونکہ وہ بڑے قد آور لوگ تھے اس لیے ان کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور اسی لیے سورۃ الحاقہ کی مذکورہ بالا آیت میں انہیں زمین پر پڑے ہوئے کھجور کے تنوں سے تشبیہہ دی گئی ہے۔

﴿فَاَصْبَحُوْا لَا یُرٰٓی اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ؕ﴾ ’’پھر وہ ایسے ہو گئے کہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا سوائے ان کے مسکنوں کے۔‘‘

ان کے عالی شان گھر اور ان کی بڑی بڑی حویلیاں تو نظر آ رہی تھیں مگر ان کے مکینوں کی کچھ خبر نہیں تھی۔

﴿كَذٰلِكَ نَجْزِی الْقَوْمَ الْمُجْرِمِیْنَ ۝۲۵﴾ ’’اسی طرح ہم بدلہ دیا کرتے ہیں مجرموں کی قوم کو۔‘‘

آیت ۲۶ ﴿وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِیْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِیْهِ﴾ ’’اور ہم نے جو تمکّن انہیں دیا تھا ایسا تمکّن ہم نے تمہیں نہیں دیا ہے‘‘

قریشِ مکّہ کو مخاطب کر کے بتایا جا رہا ہے کہ جو طاقت اور شان و شوکت قومِ عاد کو عطا ہوئی تھی اور جو وسائل انہیں میسّر تھے تم لوگوں کے پاس تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ قبل ازیں سورۃ الاعراف کی آیت ۶۹ کے ضمن میں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ تہذیب و تمدن کے اعتبار سے قومِ عاد اپنے زمانے کی بہت ترقی یافتہ قوم تھی۔ شداد اسی قوم کا بادشاہ تھا جس نے خصوصی طور پر ایک شہر بسا کر اسے جنتِ ارضی کا نام دیا تھا۔ قومِ عاد کا علاقہ اب لق و دق صحرا کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس صحرا میں شدّاد کے مذکورہ شہر کی باقیات زیرِ زمین سیٹلائیٹ کے ذریعے سے دریافت ہو چکی ہیں۔ حتیٰ کہ شہر کی فصیل پر بنے ہوئے ۳۰ کے قریب ستون بھی گن لیے گئے ہیں۔ اسی طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ تمام نشانیاں ایک ایک کر کے دنیا کے سامنے آتی چلی جائیں گی جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔

﴿وَّجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۡ﴾ ’’اور ہم نے انہیں کان‘ آنکھیں اور دل (یا عقلیں) عطا کیے تھے۔‘‘

﴿فَمَآ اَغْنٰی عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَیْءٍ﴾ ’’تو ان کے کچھ بھی کام نہ آئے ان کے کان‘ نہ ان کی آنکھیں اور نہ ہی ان کے دل (عقلیں)‘‘

﴿اِذْ كَانُوْا یَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۲۶﴾ ’’جبکہ وہ انکار ہی کرتے رہے اللہ کی آیات کا اور ان کو گھیر لیا اسی چیز نے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔‘‘

آیت ۲۷ ﴿وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰی﴾ ’’اور ہم نے ہلاک کیا ہے بہت

سی ایسی بستیوں کو جو تمہارے اردگرد آباد تھیں‘‘

وہ تمام اقوام جن کے انجام کا ذکر قرآن میں تکرار کے ساتھ آیا ہے جزیرہ نمائے عرب کے اردگرد کے علاقوں میں آباد تھیں۔ احقاف یعنی قومِ عاد کا علاقہ مکہ سے جنوب مشرق میں واقع تھا۔ قومِ ثمود کا علاقہ (مدائن صالح) مکہ سے شمال میں تھا اور شمال ہی کے رخ میں حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا علاقہ مدین تھا۔ جبکہ بحیرۂ مردار (Dead Sea) کے ساحل پر حضرت لوط علیہ السلام کی قوم آباد تھی۔ اس قوم کے شہروں کے کھنڈرات بھی بحیرۂ مردار کے اندر سے دریافت ہو چکے ہیں۔

﴿وَصَرَّفْنَا الْاٰیٰتِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ۝۲۷﴾ ’’اور ہم نے پھیر پھیر کر ان کو اپنی آیات سنائیں تاکہ وہ رجوع کریں۔‘‘

آیت ۲۸ ﴿فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ؕ﴾ ’’تو کیوں نہ مدد کی ان کی اُن ہستیوں نے جن کو انہوں نے اللہ کے سوا معبود بنا رکھا تھا تقرّب (الی اللہ) کا ذریعہ سمجھتے ہوئے!‘‘

ان کا خیال تھا کہ ان کے معبود انہیں اللہ کے قریب کرنے کا ذریعہ بنیں گے اور ہر مشکل میں ان کی مدد کریں گے۔

﴿بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ﴾ ’’بلکہ وہ سب تو ان سے گم ہو گئے‘‘

جب ان پر عذاب آیا تو ان کے معبودوں میں سے کوئی بھی ان کے کام نہ آیا اور انہیں یوں لگا جیسے کہ حقیقت میں ان کے معبودوں کا کوئی وجود تھا ہی نہیں‘ بس بقول میر دردؔ: ؏ ’’خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا‘ جو سنا افسانہ تھا!‘‘

﴿وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ۝۲۸﴾ ’’اور یہ تھا ان کا جھوٹ اور جو کچھ وہ افترا کر رہے تھے۔‘‘

آئندہ آیات میں ان جنّات کا ذکر ہوا ہے جو رسول اللہ ﷺ سے قرآن سن کر ایمان لے آئے اور پھر اپنی قوم کی طرف مبلّغ بن کر لوٹے۔ یہ واقعہ حضور ﷺ کے طائف سے واپسی کے سفر کے دوران پیش آیا۔ وہ ایام حضور ﷺ کے لیے یقیناً بہت سخت تھے۔ ایک طرف آپ اہلِ طائف کے رویے کی وجہ سے دل گرفتہ تھے تو دوسری طرف مکہ واپس جانے کے لیے بھی حالات سازگار نہیں تھے۔ اس صورت حال میں آپ نے چند دن وادیٔ نخلہ میں قیام فرمایا۔ وہاں ایک دن آپ فجر کی نماز ادا فرما رہے تھے کہ جنوں کی ایک جماعت کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نماز میں

حضور ﷺ امام تھے اور آپؐ کے آزاد کردہ غلام اور منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ مقتدی تھے۔ وادی کی کھلی فضا، فجر کا وقت اور اللہ کے رسول ﷺ کی زبانِ اطہر سے ’’قرآن الفجر‘‘ (بنی اسرائیل: ۷۸) کی طویل قراءت! قریب سے گزرتے ہوئے جِنّات ٹھٹک کر رہ گئے۔ آپؐ قرآن پڑھتے رہے اور وہ سنتے رہے۔ قراءت ختم ہوئی تو ان کی دنیا بدل چکی تھی، وہ سب کے سب ایمان لے آئے، بلکہ واپس جا کر انہوں نے اپنی قوم میں فوراً تبلیغ بھی شروع کر دی۔ جنات کا یہ واقعہ ہمارے لیے اس لحاظ سے لائقِ عبرت ہے کہ جِنّات نے ایک ہی مرتبہ قرآن سنا اور وہ نہ صرف ایمان لے آئے بلکہ قرآن کے داعی اور مبلّغ بھی بن گئے، لیکن ہم بار بار قرآن سنتے ہیں اور ہر بار گویا ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتے ہیں۔ نہ تو قرآن ہمارے دلوں میں اترتا ہے اور نہ ہی ہماری زندگیوں میں اس سے کوئی تبدیلی آتی ہے۔

آیات ۲۹ تا ۳۵

وَ اِذۡ صَرَفۡنَاۤ اِلَیۡکَ نَفَرًا مِّنَ الۡجِنِّ یَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ ۚ فَلَمَّا
حَضَرُوۡہُ قَالُوۡۤا اَنۡصِتُوۡا ۚ فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوۡا اِلٰی قَوۡمِہِمۡ مُّنۡذِرِیۡنَ ﴿۲۹﴾
قَالُوۡا یٰقَوۡمَنَاۤ اِنَّا سَمِعۡنَا کِتٰبًا اُنۡزِلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰی مُصَدِّقًا لِّمَا
بَیۡنَ یَدَیۡہِ یَہۡدِیۡۤ اِلَی الۡحَقِّ وَ اِلٰی طَرِیۡقٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۳۰﴾ یٰقَوۡمَنَاۤ
اَجِیۡبُوۡا دَاعِیَ اللّٰہِ وَ اٰمِنُوۡا بِہٖ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِکُمۡ وَ یُجِرۡکُمۡ مِّنۡ
عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۳۱﴾ وَ مَنۡ لَّا یُجِبۡ دَاعِیَ اللّٰہِ فَلَیۡسَ بِمُعۡجِزٍ فِی
الۡاَرۡضِ وَ لَیۡسَ لَہٗ مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءُ ؕ اُولٰٓئِکَ فِیۡ ضَلٰلٍ
مُّبِیۡنٍ ﴿۳۲﴾ اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّ اللّٰہَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ
وَ لَمۡ یَعۡیَ بِخَلۡقِہِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یُّحۡیِۦَ الۡمَوۡتٰی ؕ بَلٰۤی اِنَّہٗ عَلٰی کُلِّ
شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۳۳﴾ وَ یَوۡمَ یُعۡرَضُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا عَلَی النَّارِ ؕ اَلَیۡسَ
ہٰذَا بِالۡحَقِّ ؕ قَالُوۡا بَلٰی وَ رَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا کُنۡتُمۡ
تَکۡفُرُوۡنَ ﴿۳۴﴾ فَاصۡبِرۡ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ وَ لَا
تَسۡتَعۡجِلۡ لَّہُمۡ ؕ کَاَنَّہُمۡ یَوۡمَ یَرَوۡنَ مَا یُوۡعَدُوۡنَ ۙ لَمۡ یَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا
سَاعَۃً مِّنۡ نَّہَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَہَلۡ یُہۡلَکُ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۳۵﴾

آیت ۲۹ ﴿وَاِذۡ صَرَفۡنَاۤ اِلَیۡکَ نَفَرًا مِّنَ الۡجِنِّ یَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ ۚ﴾ ’’اور (اے نبی ﷺ!) جب ہم نے آپ کی طرف متوجہ کر دیا جِنّات کی ایک جماعت کو کہ وہ قرآن سننے لگے۔‘‘

﴿فَلَمَّا حَضَرُوۡہُ قَالُوۡۤا اَنۡصِتُوۡا ۚ﴾ ’’تو جب وہ وہاں پہنچے تو انہوں نے کہا: چپ ہو جاؤ!‘‘

تلاوتِ قرآن کی سماعت کے بارے میں خود قرآن کا بھی یہی حکم ہے: ﴿وَاِذَا قُرِیَٔ الۡقُرۡاٰنُ فَاسۡتَمِعُوۡا لَہٗ وَاَنۡصِتُوۡا لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۲۰۴﴾﴾ (الاعراف) ’’اور جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو اسے پوری توجہ کے ساتھ سنا کرو اور خاموش رہا کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے‘‘۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ طبعاً نیک اور شریف قسم کے جِنّات تھے۔ اگلی آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے اہلِ کتاب جِن تھے۔ چنانچہ وہ فوراً ہی اللہ کے کلام کو پہچان گئے اور اس کو پورے ادب و احترام سے سننے لگے۔

﴿فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوۡا اِلٰی قَوۡمِہِمۡ مُّنۡذِرِیۡنَ ﴿۲۹﴾﴾ ’’پھر جب (قراءت) ختم ہوئی تو وہ پلٹے اپنی قوم کی طرف خبردار کرنے والے بن کر۔‘‘

آیت ۳۰ ﴿قَالُوۡا یٰقَوۡمَنَاۤ اِنَّا سَمِعۡنَا کِتٰبًا اُنۡزِلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰی﴾ ’’انہوں نے کہا: اے ہماری قوم کے لوگو! ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰؑ کے بعد نازل ہوئی ہے‘‘

گویا وہ جنات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے امتی تھے۔ یہاں پر جنات کے اس قول کے حوالے سے یہ نکتہ لائق توجہ ہے کہ تورات کے بعد جو ’’کتاب‘‘ نازل ہوئی وہ قرآن ہے۔ اگرچہ ہم عرفِ عام میں انجیل کو بھی کتاب کہہ دیتے ہیں لیکن وہ اصطلاحی مفہوم میں باقاعدہ ’’کتاب‘‘ نہیں تھی۔ اس لیے کہ اس میں شریعت نہیں تھی۔ دراصل لفظ ’’کتاب‘‘ میں لغوی اعتبار سے شریعت (قوانین، احکام، فرائض وغیرہ) کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں احکام کی فرضیت کا ذکر اکثر ’’کتب‘‘ کے مشتقات کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۰۳ میں نماز کے اوقات کے حوالے سے ’’کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا‘‘ کے الفاظ آئے ہیں، پھر سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۳۵ میں ’’کتاب‘‘ کا لفظ ’’عدت‘‘ کے مترادف کے طور پر آیا ہے: ﴿حَتّٰی یَبۡلُغَ الۡکِتٰبُ اَجَلَہٗ ؕ﴾۔ اور ’’کُتِبَ عَلَیۡکُمۡ‘‘ کے الفاظ تو قرآن میں بہت تکرار سے آئے ہیں۔

ظاہر ہے مذکورہ جِنّات اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اُمتی تھے تو وہ لازماً انجیل کو بھی جانتے ہوں گے۔

لیکن انہوں نے اس کا ذکر کرنے کے بجائے صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حوالہ دیا کہ آپؑ کے بعد اب ایک کتاب نازل ہوئی ہے جس کی تلاوت ہم سن کر آئے ہیں۔ اس سے یہ نکتہ واضح ہوجاتا ہے کہ اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے لفظ ''کتاب'' کا اطلاق تورات پر ہوتا ہے یا پھر قرآن پر' اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شریعتِ موسویؑ کے بعد جو شریعت آئی ہے وہ شریعتِ محمدیؐ ہے۔

﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۳۰﴾ ''تصدیق کرتی ہوئی اُس کی جو اس کے سامنے موجود ہے (یعنی تورات) راہنمائی کرتی ہے حق کی طرف اور ایک سیدھے راستے کی طرف۔''

''طریقِ مستقیم'' کا بھی وہی مفہوم ہے جو ''صراطِ مستقیم'' کا ہے۔ طریق اور صراط دونوں کے لغوی معنی راستے کے ہیں۔ اسی طرح لفظ سبیل بھی راستے کے معنی دیتا ہے اور ''سواء السّبیل'' کے معنی بھی سیدھے راستے کے ہیں۔

آیت ۳۱ ﴿يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ﴾ ''اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ کی طرف پکارنے والے کی پکار پر لبیک کہو''

﴿وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۳۱﴾ ''اور اس پر ایمان لے آؤ تا کہ وہ (اللہ) تمہارے گناہوں کو بخش دے اور تمہیں ایک دردناک عذاب سے بچالے۔''

آیت ۳۲ ﴿وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ﴾ ''اور جو کوئی لبیک نہیں کہتا اللہ کی طرف پکارنے والے کی پکار پر تو وہ اللہ کو عاجز کرنے والا نہیں ہے زمین میں''

﴿وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۳۲﴾ ''اور نہیں ہوں گے اُس کے لیے اللہ کے مقابلے میں دوسرے مددگار۔ یہی لوگ کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔''

یہاں پر ''دَاعِيَ اللّٰهِ'' کے حوالے سے یہ نکتہ ذہن میں مستحضر رکھنے کی ضرورت ہے کہ جب تک دنیا میں نبوت کا سلسلہ جاری تھا انبیاء ورسل علیہم السلام ہی ''اللہ کے داعی'' تھے۔ لیکن اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کے اُمتیوں کو ''دَاعِيَ اللّٰهِ'' کی حیثیت سے لوگوں کو قرآن کی طرف بلانا ہے' انہیں اقامتِ دین کا بھولا ہوا سبق یاد دلانا ہے اور اس جدوجُہد میں اپنا تن من دھن کھپانے کے لیے انہیں اس طرح آمادہ کرنا ہے کہ ہر بندۂ مؤمن کی زندگی سورۃ الانعام کی اس

آیت کی تصویر بن جائے: ﴿اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۶۲﴾ ''آپؐ کہیے: میری نماز' میری قربانی' میری زندگی اور میری موت اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔''

اس کام کے لیے اب چونکہ کوئی نبی نہیں آئے گا' اس لیے ''دعوت الی اللہ'' کا یہ مقدس فریضہ اس امت کو سونپ دیا گیا ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ﴾ (البقرۃ:۱۴۳) ''اور (اے مسلمانو!) اسی طرح ہم نے تمہیں ایک اُمتِ وسط بنایا ہے تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہوجاؤ اور رسولؐ تم پر گواہ ہو''۔ سورۂ آلِ عمران میں اس ذمہ داری کی مزید وضاحت اس طرح فرمائی گئی: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ﴾ (آیت ۱۱۰) ''تم وہ بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کے لیے برپا کیا گیا ہے' تم نیکی کا حکم کرتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر۔''

آیت ۳۳ ﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓي اَنْ يُّـحْيِۦ الْمَوْتٰى ۭ﴾ ''کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق فرمائی اور ان کی تخلیق سے تھکا نہیں' وہ اس پر قادر ہے کہ مُردوں کو زندہ کردے!''

یہ عقلی دلیل ہے اس شخص کے لیے جو اللہ کو ''خالق'' تو مانتا ہے مگر بعث بعد الموت پر یقین نہیں رکھتا۔ سورۂ قٓ کی آیت ۱۵ میں بھی ایسے ''فلسفیوں'' سے سوال کیا گیا ہے: ﴿اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ۭ﴾ کہ کیا ہم کائنات اور اس کی مخلوقات کو ایک دفعہ تخلیق کرنے کے بعد تھک گئے ہیں؟ کیا اب ہماری تخلیقی سرگرمیاں معطل ہوگئی ہیں؟ اور کیا مزید نئی چیزیں بنانے کی ہماری صلاحیت اب ختم ہوکر رہ گئی ہے؟

﴿بَلٰٓي اِنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۳۳﴾ ''کیوں نہیں' یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

آیت ۳۴ ﴿وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَي النَّارِ ۭ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ۭ﴾ ''اور جس روز پیش کیے جائیں گے یہ کافر آگ پر' (اور ان سے پوچھا جائے گا:) کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟''

کہ دنیا میں تو تم لوگ بعث بعد الموت کی باتوں کو ڈھکوسلے سمجھتے تھے' آخرت اور اس کی سزا

وجزا کی خبروں کو فرضی کہانیاں قرار دیتے تھے جبکہ جہنم اور اس کے عذاب کی وعیدیں تمہیں محض جھوٹے ڈراوے لگتے تھے۔ آج تم دوبارہ زندہ ہو کر ''آخرت'' کے عالم میں پہنچ چکے ہو' اب تم آخرت کے تمام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ دیکھو! یہ ہے جہنم کی آگ تمہارے سامنے جس کے بارے میں تمہیں بار بار خبردار کیا گیا تھا۔ اب بتاؤ کیا یہ حقیقت ہے یا تمہارا وہم؟

﴿قَالُوْا بَلٰی وَرَبِّنَا ؕ﴾ ''وہ کہیں گے: کیوں نہیں! ہمارے پروردگار کی قسم یہ (حق ہے)!''

﴿قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۳۴﴾ ''اللہ فرمائے گا: تو اب چکھو عذاب کا مزہ اپنے اس کفر کی پاداش میں جو تم کرتے رہے ہو۔''

اب آخر میں حضور ﷺ کو مخاطب کر کے خصوصی ہدایت دی جا رہی ہے:

آیت ۳۵ ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ ''تو (اے محمد ﷺ!) آپ بھی صبر کیجیے جیسے اولوالعزم رسولؑ صبر کرتے رہے ہیں''

''اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ'' کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ ان سے مراد وہ پانچ پیغمبر ہیں جن کا ذکر قبل ازیں سورۃ الشوریٰ کی اس آیت میں ہوا ہے: ﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى ...﴾ (آیت ۱۳) ''(اے مسلمانو!) تمہارے لیے دین میں اُس نے وہی کچھ مقرر کیا ہے جس کی وصیت اُس نے نوحؑ کو کی تھی اور جس کی وحی ہم نے (اے محمد ﷺ!) آپ کی طرف کی ہے اور جس کی وصیت ہم نے کی تھی ابراہیمؑ کو اور موسیٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو......'' گویا حضرت محمد ﷺ کے علاوہ حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام کے نام اس فہرست میں شامل ہیں۔ البتہ بعض علماء حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام کو بھی ان کے ساتھ شامل کرتے ہیں اور اس طرح ان کے نزدیک ''اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ'' کی تعداد سات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں میں ہر پیغمبر کی شخصیت کا کوئی خاص پہلو امتیازی شان کا حامل نظر آتا ہے۔ مثلاً دعوت و تبلیغ کے میدان میں عزم اور استقامت کے لحاظ سے حضرت نوح علیہ السلام سب سے آگے ہیں۔ آپؑ نے ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم کو دعوت دی اور ان کی طرف سے ہر قسم کی مخالفت اور تکلیف کو برداشت کیا: ﴿فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ﴾ (العنکبوت:۱۴)۔ اسی طرح ذاتی تکلیف اور بیماری پر صبر کرنے کے اعتبار سے حضرت ایوب علیہ السلام کا مرتبہ بہت بلند ہے

اور اس لحاظ سے ''صبرِ ایوبؑ'' ضرب المثل کے طور پر مشہور ہے۔

﴿وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ﴾ ''اور ان کے لیے جلدی نہ کیجیے!''

اس سے پہلے سورۃ الزخرف کے اختتام پر بھی ایسی ہی ہدایت دی گئی ہے: ﴿فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ؕ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۸۹﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ ان سے درگزر کیجیے اور کہیے سلام ہے' تو بہت جلد یہ لوگ جان جائیں گے''۔ پھر سورۃ الدخان کے آخر میں بھی فرمایا گیا ہے: ﴿فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ۵۹﴾ ''تو آپؐ انتظار کیجیے' یقیناً وہ بھی انتظار کر رہے ہیں''۔ ایک ہی گروپ کی ان سورتوں میں ایک جیسے الفاظ اور مفہوم کی حامل ان آیات کی تکرار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان سورتوں کے نزول کے زمانے میں مکہ کے حالات اہلِ ایمان کے لیے واقعتاً بہت سخت تھے اور ان کے لیے ایک ایک دن گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ ان حالات میں ممکن ہے کبھی حضور ﷺ کے دل میں بھی یہ خیال آتا ہو' لیکن اہلِ ایمان کے ذہنوں میں ایسے سوالات کا آنا بالکل قرینِ قیاس ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دشمنانِ حق کو ہم پر ظلم و ستم ڈھانے کی کھلی چھوٹ آخر کیوں دے رکھی ہے؟ ان لوگوں پر پہلی نافرمان قوموں کی طرح عذاب کیوں نہیں ٹوٹ پڑتا؟ بلالؓ پر تشدد کرتے ہوئے اُمیہ بن خلف کے ہاتھ کیوں شل نہیں ہو جاتے؟ اللہ تعالیٰ تو عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ہے۔ وہ اپنے ان باغیوں کو اتنی ڈھیل کیوں دیے جا رہا ہے؟ چنانچہ اس انتہائی نازک صورتِ حال میں حضور ﷺ کو مخاطب کر کے گویا اہلِ ایمان کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ مشرکینِ مکّہ پر عذاب کا وقت ابھی نہیں آیا' ابھی اللہ کی مشیت میں ان لوگوں کو کچھ اور مہلت دینا مقصود ہے۔ لہٰذا تم لوگ صبر سے کام لو اور کچھ دیر مزید انتظار کرو!

﴿كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ؕ﴾ ''جس دن یہ لوگ دیکھیں گے اس (عذاب) کو جس کی انہیں وعید سنائی جا رہی ہے (تو ایسے محسوس کریں گے) گویا نہیں رہے تھے (دنیا میں) مگر دن کی ایک گھڑی۔''

﴿بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ۳۵﴾ ''یہ پہنچا دینا ہے! کیا سوائے نافرمان لوگوں کے کوئی اور بھی ہلاک کیا جائے گا؟''

یعنی ہمارے رسولؐ کی ذمہ داری تو ان لوگوں تک اللہ کا یہ پیغام پہنچا کر حجت قائم کر دینے کی حد تک ہے' جو انہوں نے ادا کر دی —— اب ہلاک تو وہی ہوں گے جنہوں نے اس دعوتِ حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور نافرمانی کی روش اختیار کی۔ ۞۞۞

شہادتِ حضرات عمرؓ عثمانؓ وعلی رضی اللہ عنہم

کا تاریخی پس منظر

فلسفۂ انقلاب کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ نے ۱۲ ستمبر اور ۱۹ ستمبر ۱۹۸۶ء کو جامع مسجد دار السلام باغِ جناح‘ لاہور میں اپنے خطاباتِ جمعہ کے دوران ’’فلسفۂ انقلاب‘‘ کی روشنی میں نبی اکرم ﷺ کے اسلامی انقلاب کے خلاف انقلاب سے متاثر ہونے والی اندرونی اور بیرونی قوتوں کے ردِّعمل اور اُن کے نتائج کا تاریخی تجزیہ پیش کیا تھا۔ اس خطاب کے بعض اجزاء پر مبنی ایک خبر کی اشاعت پر اہلِ تشیع نے لاہور میں امیر تنظیم کے خلاف جلوس نکالا اور اُن کا پتلا بھی جلایا۔ خطاب کی اس اہمیت کے پیشِ نظر ہفت روزہ ’’چٹان‘‘ نے ۲۱ ستمبر ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں اسے کیسٹ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے من وعن شائع کر دیا‘ جسے ضروری حک واضافے اور اغلاط کی تصحیح کے بعد ہفت روزہ ’’چٹان‘‘ کے شکریے کے ساتھ ماہنامہ میثاق‘ نومبر ودسمبر ۱۹۸۶ء میں شائع کیا گیا۔ ثُلث صدی گزرنے کے بعد یہ اہم خطاب دوبارہ قارئینِ میثاق کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

حضرات! آج میرا موضوع ’’شہادتِ حضرت عمرؓ‘ شہادتِ حضرت عثمانؓ‘ شہادتِ حضرت علیؓ اور شہادتِ حضرت حسین رضی اللہ عنہم کا تاریخی پس منظر‘‘ ہے۔ ان تاریخی واقعات کے منظر اور پس منظر کو سمجھنے کے لیے تاریخ اور فلسفہ تاریخ کے مفہوم اور فرق کو ذہن نشین کرنا بہت ضروری ہے۔ تاریخ میں صرف واقعات کی تفصیلات اور ان کے نتائج بیان کیے جاتے ہیں‘ اُن کے اسباب وعلل اور محرکات وعوامل پر گفتگو نہیں ہوتی‘ جبکہ فلسفہ تاریخ میں اُن عوامل اور

محرکات سے بحث ہوتی ہے جو واقعات کے پس پردہ ہوتے ہیں۔ یعنی یہ واقعات کیوں ظہور پذیر ہوئے‘ کسی کو شکست اور کسی کو فتح کیوں ہوئی۔ کوئی تہذیب عروج پر کیوں پہنچی اور کوئی زوال سے کیوں دوچار ہوئی۔ اس اعتبار سے ہماری گفتگو کا تعلق تاریخ سے کم اور فلسفۂ تاریخ سے زیادہ ہے۔ فلسفہ تاریخ میں بھی اُس کے دو پہلوؤں کے درمیان فرق وامتیاز کو پیش نظر رکھنا لازم ہے۔ ایک شے ہے قوموں کا عروج وزوال اور ایک شے ہے نظریات اور تہذیبوں کا عروج وزوال۔ ان دونوں کے درمیان زمین وآسمان کا فرق ہے۔ ایک تہذیب اُبھری لیکن اُس کے اصل عوامل قومی تھے‘ یعنی کسی نسلی‘ لسانی یا وطنی بنیاد پر کوئی قوم اُٹھی‘ اُس نے عروج واقتدار حاصل کیا‘ پھر زوال سے دوچار ہوگئی۔ قوموں کا یہ عروج وزوال دو مختلف چیزیں ہیں۔

فلسفۂ انقلاب

نظریات کی بنیاد پر جو تبدیلیاں آتی ہیں اُنہیں ہم ’’انقلابات‘‘ کا نام دیتے ہیں۔ مشہور ہندو انقلابی رہنما ایم این رائے نے اپنی کتاب ’’دی ہسٹاریکل رول آف اسلام‘‘ میں اس فرق کو خوب واضح کیا ہے۔ اُس کے مطابق اسلام کا عروج وزوال دُنیا کی دوسری قوموں کے عروج وزوال کے مطابق یا اُن جیسا نہیں۔

قومی بنیادوں پر تاریخ میں بڑی بڑی قومیں اُٹھیں۔ ایک زمانے میں منگولوں نے عروج حاصل کیا‘ ایک دور میں ہُن قوم بڑے زور شور سے اٹھی اور دُنیا پر چھا گئی۔ سکندر اعظم مقدونیہ سے چلا اور دریائے بیاس تک اپنی فتح کے پھریرے اُڑاتا چلا گیا۔ ان فاتحین نے خوں ریزیاں بھی کیں اور غلبہ واقتدار بھی حاصل کیا لیکن یہ کسی نئی تہذیب کے بانی نہ بن سکے۔ ان سے دُنیا کو کوئی نئی روشنی نہیں ملی۔ لیکن عرب جب اسلام کی مشعل لے کر نکلے اور انہوں نے اقتدار وحکومت پر قبضہ کیا تو انسانیت کو ایک نئی تہذیب اور نیا تمدن ملا اور علوم وفنون کے نئے اُفق طلوع ہوئے۔ بقول علامہ اقبال ؎

در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

محمد رسول اللہ ﷺ نے ایک نظریاتی تبدیلی برپا کی۔ اس تبدیلی کی علمبردار بھی

بلاشبہ ایک قوم تھی ——— ’’اُمیّین‘‘ کی قوم۔ قرآن کے الفاظ میں:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۤ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۲﴾ (الجمعة)

’’وہی ہے جس نے اُمیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اُٹھایا‘ جو اُنہیں اُس کی آیات سناتا ہے‘ اُن کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے‘ حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔‘‘

یہ اُمیّین‘ یعنی بنی اسماعیلؑ اُمّتِ مُسلمہ کا قلب یا نیوکلیس (nucleus) تو بنے لیکن پھر اُمّت میں نئے قبائل اور نئی قومیں شامل ہوتی چلی گئیں اور یوں ایک نئی تہذیب کا آغاز ہوا۔ اس لیے آج ہمیں جن واقعات پر گفتگو کرنی ہے وہ بھی درحقیقت فلسفۂ تاریخ کے اُس پہلو کے حوالے سے سمجھ میں آسکتے ہیں جو نظریات اور تہذیبوں کے عروج وزوال سے بحث کرتا ہے اور جس کے لیے زیادہ موزوں عنوان ’’فلسفۂ انقلاب‘‘ ہے۔

درحقیقت فلسفہ انقلاب کو سمجھے بغیر حضور ﷺ کی سیرت کا سمجھنا بھی ممکن نہیں ہے۔ اگر فلسفۂ انقلاب پر ذہن کی گرفت مکمل نہیں ہے تو سیرتِ رسولؐ میں بھی تضادات نظر آئیں گے۔ بظاہر یہ کتنا بڑا تضاد ہے کہ مکہ مکرمہ میں حکم یہ ہے کہ چاہے تمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا جائے‘ چاہے تمہارے چیتھڑے اڑا دیے جائیں تم ہاتھ نہیں اٹھا سکتے‘ لیکن مدینہ منوّرہ میں محمد رسول اللہ ﷺ اور اُن کے ساتھی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اللہ کی راہ میں حکم قرآنی کے مطابق قتال کر رہے ہیں:

﴿يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ﴾ (التوبة:١١١)

’’وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں جس میں قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں۔‘‘

ایک مثال اور دیکھئے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور اکرم ﷺ بظاہر دب کر صلح کر رہے ہیں اور آپؐ کے تمام ساتھیوں کا خون کھول رہا ہے کہ ہم حق پر ہیں اور حق کا یہ حق ہے کہ وہ غالب ہو کر رہے‘ لیکن حضور ﷺ صلح کر رہے ہیں۔ دو سال بعد مکہ کے وہی سردار ابوسفیانؓ

خوشامد کر رہے ہیں‘ سفارشیں کروا رہے ہیں کہ صلح کی تجدید فرما لیجیے‘ لیکن حضور ﷺ تجدید نہیں کر رہے۔

یہ ظاہری تضادات تب رفع ہوتے ہیں جب فلسفۂ انقلاب سمجھ میں آتا ہے‘ لہٰذا اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے۔ انقلاب کے چھ مراحل ہوتے ہیں۔ پہلے تین مراحل: دعوت‘ تنظیم اور تربیت —— کے نتیجے میں انقلابی جماعت وجود میں آتی ہے۔ یہ جماعت جب تک اتنی قوی اور مضبوط نہ ہو جائے کہ نظامِ باطل کو للکار سکے اور اس سے ٹکرا سکے‘ اس وقت تک یہ جماعت Passive Resistance یعنی صبرِ محض یا عدمِ تشدد کا راستہ اختیار کرے گی۔ ماریں کھائیں گے‘ جیل جائیں گے‘ ہر طرح کا تشدد برداشت کریں گے‘ لیکن ہاتھ نہیں اٹھائیں گے —— یہ چوتھا مرحلہ ہے۔ لیکن جب یہ محسوس ہو کہ ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ ہم اس نظام کو جڑ سے اُکھاڑنے کے لیے اقدام کر سکتے ہیں تو پھر پانچواں مرحلہ Active Resistance کا آتا ہے۔ یعنی اب خود آگے بڑھ کر اقدام کیا جائے گا۔ اس کے نتیجے میں چھٹا اور آخری مرحلہ مسلّح تصادم (Armed Conflict) کی صورت میں خودبخود سامنے آئے گا۔ یہ فیصلہ کن مرحلہ ہے۔ اگر باقاعدہ تیاری‘ تنظیم اور منصوبہ بندی سے اقدام کیا گیا ہے‘ جماعت تربیت یافتہ ہے‘ تعداد مناسب ہے تو پھر انقلابی قوت کامیاب ہو گی اور سابقہ نظام کو اکھاڑ کر اپنا نظام قائم کرے گی۔ لیکن اگر وقت سے پہلے اقدام کیا گیا‘ یا تیاری مکمل نہیں کی گئی تو وہ باطل نظام جو پہلے سے قائم ہے‘ انقلابی جماعت کو کچل دے گا اور جماعت ختم ہو جائے گی۔ گویا تخت یا تختہ۔ تیسرا کوئی امکان نہیں۔

حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں انقلابی عمل کے چھ مراحل میں سے پہلے چار مرحلے دعوت‘ تنظیم‘ تربیت اور صبرِ محض مکی دَور میں مکمل ہوئے اور آخری دو مرحلے اقدام اور مسلّح تصادم مدنی دَور میں پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ مدینہ میں اقدام (Active Resistance) اور مسلّح تصادم (Armed Conflict) کا سلسلہ چھ برس تک جاری رہا۔ پہلا تصادم غزوۂ بدر کی صورت میں رمضان ۲ ہجری میں ہوا اور ٹھیک چھ برس بعد رمضان ۸ ہجری میں مکہ فتح ہو گیا اور عرب کی حد تک انقلاب کی تکمیل ہو گئی۔

تکمیلِ انقلاب کے بعد توسیعِ انقلاب کا مرحلہ آتا ہے۔ ایک سچا انقلاب کسی جغرافیائی یا قومی حدود کا پابند نہیں ہوتا۔ نظریے کو کسی پاسپورٹ اور ویزے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر نظریے میں جان ہے، قوت ہے، وہ دلیل اور برہان سے مسلح ہے تو پھیلے گا۔ جہاں جڑ پکڑ لے گا انقلاب لے آئے گا۔ توسیعِ انقلاب کا آغاز بھی حضور اکرم ﷺ نے صلح حدیبیہ کے فوراً بعد ۶ ہجری میں ہی ایران و روم کے حکمرانوں اور بلادِ عرب کے شیوخ کے نام دعوتی خطوط بھیج کر فرما دیا تھا۔ جس طرح آج متحدہ عرب امارات اور ان کے اردگرد کے علاقوں میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور ان کے شیوخ ہیں، کچھ ایسی ہی کیفیت عہدِ رسالت میں بھی ان علاقوں میں پائی جاتی تھی —— ان خطوط کے جواب میں دو بالکل متضاد ردِّعمل سامنے آئے۔ ایک کسریٰ شہنشاہِ ایران کا ردِّعمل تھا۔ اس نے حضور ﷺ کا نامۂ مبارک چاک کر دیا، سفیرِ اسلام کو قتل کی دھمکی دی اور انتہائی اہانت آمیز سلوک کیا۔ وہ اپنے آپ کو عرب کا حکمران سمجھتا تھا۔ ایرانی سلطنت کے نزدیک عرب قبائل کی حیثیت کم و بیش ایسی ہی تھی جیسے حکومت پاکستان کے لیے شمال مغربی سرحدی صوبے کے آزاد قبائل کی ہے۔ اگرچہ ہمارے قانون اور عدالتوں کے حدودِ اختیارات وہاں تک نہیں ہیں لیکن بہرحال وہ پاکستان کی حدود میں تو شامل ہیں۔ چنانچہ اس نے کہا کہ میری رعیت میں سے ایک شخص کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ اس نے اپنا نام میرے نام سے پہلے لکھا۔ یمن کے ایرانی گورنر باذان کو اُس نے خط لکھا کہ مدینہ کے کسی گستاخ شخص (نقل کفر کفر نباشد) محمد (ﷺ) نے مجھے توہین آمیز خط لکھا ہے، اس کو گرفتار کر کے میرے دربار میں پیش کرو۔ اور ایسا نہ ہو سکے تو مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ یہ ایک نمائندہ ردِّعمل تھا۔ دوسرا نمائندہ ردِّعمل قیصرِ روم کا تھا۔ اس نے حضور ﷺ کے ایلچی کا پورا اعزاز و اکرام کیا۔ قیصر اہلِ کتاب میں سے تھا، اپنے مذہب کا عالم تھا، وہ فوراً حضور اکرم ﷺ کو پہچان گیا۔ اُس نے کوشش کی کہ اس کے درباری، سپہ سالار، عمائدینِ سلطنت سب اسلام قبول کر لیں۔ جس طرح تاریخ میں اس سے پہلے ایک موقع پر پوری سلطنت روم نے بیک وقت (en bloc) عیسائیت کو قبول کیا تھا اسی طرح اب اسلام کو اپنا لے، تاکہ قبولِ اسلام کے ساتھ اس کی سلطنت اور حکومت بھی

باقی رہے۔ لیکن ایسا ممکن نہ ہوا۔ سلطنت اس کے پاؤں کی بیڑی بن گئی اور وہ ایمان کی دولت سے محروم ہی رہا۔ یہی طرزِ عمل مقوقس شاہِ مصر کا بھی تھا۔ اس نے بھی حضور ﷺ کے ایلچی کا اکرام کیا، تحفے تحائف بھیجے لیکن ایمان سے محروم رہا۔ بہرحال یہ دو مختلف ردِّعمل تھے جن کا اظہار اس وقت کی دو بڑی عالمی طاقتوں (super powers) کی جانب سے ہوا۔

انقلاب مخالف قوتیں

اب اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ''فلسفۂ انقلاب'' کے حوالے سے ایک اصولی بات سمجھ لیجیے۔ جب بھی کسی ملک یا کسی معاشرے میں ایک انقلابی قوت آگے بڑھ رہی ہوتی ہے تو وہاں پہلے سے قائم نظام کے چودھری اور اُن کے حامی اور مددگار انقلابی قوت کا راستہ روکنے کے لیے اپنی ساری توانائیاں خرچ کر دیتے ہیں، اپنے سارے حربے آزما لیتے ہیں، لیکن انقلابی جدوجہد کے آخری مرحلے میں جب وہ دیکھتے ہیں کہ اب ہم انقلاب کا راستہ نہیں روک سکتے، ہم شکست کھا چکے ہیں تو ہمیشہ وہ دبک جاتے ہیں۔ بظاہر انقلاب کو تسلیم کر لیتے ہیں، لیکن منتظر رہتے ہیں کہ کوئی موقع ملے اور کوئی نازک مرحلہ آئے تو وار کریں۔ ہر انقلاب کو ان انقلاب مخالف قوتوں اور تحریکوں (Counter Revolutionary forces and movements) کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ قوتیں اندر سے بھی اُٹھتی ہیں اور توسیع انقلاب کے ردِّعمل کے طور پر باہر سے بھی نمودار ہوتی ہیں۔ دونوں سطحوں (levels) پر اُنہیں علیحدہ علیحدہ پہچاننا چاہیے۔ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں اور آپؐ کے بعد عہدِ خلافت راشدہ میں اسلامی انقلاب کو دونوں سطح پر ان قوتوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ کہاں یہ معاملہ کہ حضور ﷺ ایک ایک شخص کے لیے دعائیں کیا کرتے تھے کہ اے پروردگار! عمرو بن ہشام اور عمرؓ بن خطاب میں سے کسی ایک کو تو ایمان کی توفیق دے دے اور کہاں یہ صورت ہے کہ فوج در فوج قبیلہ در قبیلہ لوگ آ رہے ہیں، اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اُن میں یقیناً مخلصین بھی تھے، لیکن ایک قابلِ ذکر تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جنہوں نے یہ سمجھ کر کہ اب مزاحمت ممکن نہیں ہے، اسلام قبول کر لیا تھا۔ اُن کے ذہن اور فکر میں

بنیادی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ چنانچہ ایک روایت میں حضورﷺ سے یہ الفاظ بھی منسوب ہیں کہ اس وقت جو لوگ دین میں داخل ہو رہے ہیں فوج در فوج‘ یہ نکلیں گے بھی دین سے فوج در فوج (یخرجون مِنْ دین الله افواجا) اور اس کی ابتداء بھی حضورﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ہو گئی تھی۔ جب ۸ ہجری میں جنگ موتہ میں مسلمانوں کو زک اُٹھانی پڑی‘ حضرتِ زید بن حارثہ‘ حضرت جعفر طیار اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ انصاری رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر اصحابِ رسول شہید ہو گئے‘ طالع آزما لوگوں نے دیکھا کہ سلطنتِ روما سے بھی محاذ آرائی کا آغاز ہو گیا ہے تو اُنہوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کی قوت اتنی نا قابلِ شکست نہیں رہی‘ اب ہم سر اٹھا سکتے ہیں۔ چنانچہ نئے مدعیانِ نبوت حضورﷺ کی زندگی میں نمودار ہونا شروع ہو گئے۔ مسیلمہ کذّاب اُٹھا‘ ایک بڑے علاقے کے لوگ اُس کے پیرو بن گئے اور وہ بڑی سیاسی قوت بن گیا۔ اُس نے حضورﷺ کو پیغام بھیجا کہ اگر آپؐ ملک عرب کو تقسیم کر لیں اور آدھا ملک مجھے دے دیں تو ہم آپس میں مصالحت کر لیتے ہیں‘ ورنہ معاملہ میدانِ جنگ میں طے ہوگا۔ حضورﷺ نے بایں الفاظِ قرآنی جواب بھجوا دیا کہ:

﴿اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ﴾ (الاعراف:۱۲۸)

’’بے شک زمین اللہ کی ہے‘ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اُس کا وارث بنا دیتا ہے۔‘‘

اسی طرح طلحہ بن خویلد اسدی اور اسود عنسی نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ پھر ایک خاتون سجاح نبوت کا دعویٰ لے کر کھڑی ہو گئی اور اُس نے مسیلمہ کذّاب سے شادی بھی کر لی۔ گویا ایک جھوٹے نبی اور جھوٹی نبیہ نے متحدہ محاذ بنا لیا۔ ان میں سے بعض نے حضورﷺ کی حیاتِ طیبہ میں اور بعض نے آپؐ کے انتقال کے فوراً بعد نبوت کے دعوے کیے۔ اندرونِ عرب یہ پہلی انقلاب مخالف قوت تھی جس نے حضورﷺ کے انتقال کے فوراً بعد اپنا کام شروع کیا۔ حضورﷺ کے انتقال کا مرحلہ یقیناً مسلمانوں کے لیے بہت ہی حوصلہ شکن تھا۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُس وقت مسلمان کس طرح صدمے سے نڈھال ہوئے ہوں گے اور کس طرح ان کی ہمتیں پست ہوئی ہوں گی۔ اسی نازک مرحلے پر دوسری انقلاب

مخالف قوت وہ قبائل عرب تھے جنہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم مسلمان ہیں‘ مسلمان رہیں گے‘ نماز پڑھیں گے‘ لیکن زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ بعض روایات کے مطابق اُنہوں نے زکوٰۃ کا مطلقاً انکار نہیں کیا تھا‘ صرف یہ کہا تھا کہ ہم حکومت کو نہیں دیں گے‘ بلکہ اپنے طور پر زکوٰۃ کا انتظام کریں گے۔ تیسری قوت مرکز گریز طاقتوں کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ آزادی تو عربوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور وہ کسی مرکزی حکومت کے تصور سے ہی نا آشنا تھے۔ یہ تو حضورﷺ کا معجزہ تھا کہ آپؐ نے ایک جھگڑالو قوم کو بنیانِ مرصوص بنا کر ایک مرکز کے تابع کر دیا تھا۔ یہ مرکزی حکومت کا قیام بھی آزادی پسند قبائل کے مزاج کے خلاف تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں‘ مسلمان رہیں گے‘ لیکن کسی مرکزی حکومت کو تسلیم نہیں کریں گے۔

مقامِ صدّیق اکبر رضی اللہ عنہ

خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیک وقت ان تینوں انقلاب مخالف طاقتوں اور تحریکوں کا مقابلہ کیا اور ان پر قابو پایا۔ اس مرحلے پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مقام اور مرتبے کو بھی سمجھ لیجیے۔ مقامِ صدّیق‘ مقامِ نبوّت سے بہت قریب ہوتا ہے۔ سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے چار مراتب کا ذکر کرتے ہوئے انبیاء کے بعد دوسرا درجہ صِدّیقین کا بیان کیا ہے:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿٦٩﴾﴾

’’جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا وہ اُن لوگوں کے ساتھ ہو گا جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء‘ صدیقین‘ شہداء‘ صالحین۔ کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسّر آئیں!‘‘

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جسمانی اعتبار سے دبلے پتلے اور نحیف انسان تھے۔ طبیعت میں شفقت و رحمت اور نرمی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ حضورﷺ کی وفات کا صدمہ‘ خلافت کا بارِ گراں اور پھر یہ تین عظیم معاملات بیک وقت سامنے آ گئے۔ پھر چوتھا

بلکہ بنیادی مسئلہ اُس لشکر کی روانگی کا تھا جسے حضور ﷺ نے حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی سرکردگی میں تیار کروایا تھا‘ لیکن اُس کی روانگی سے پہلے حضور ﷺ انتقال فرما گئے۔ یہ رومیوں کے خلاف تیسری مہم تھی۔ پہلی بار جنگ موتہ میں مسلمانوں کو بہت نقصان ہوا۔ دوسری بار غزوۂ تبوک میں حضور ﷺ خود تشریف لے گئے تو قیصر نے مقابلے سے گریز کیا‘ کیونکہ وہ آپؐ کی نبوت کو پہچان چکا تھا۔ حضور ﷺ کی وفات کی وجہ سے اس تیسرے لشکر کی روانگی کے مسئلے پر مدینہ میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ اکثر لوگوں کی رائے یہ تھی کہ سردست اس لشکر کو روانہ نہ کیا جائے‘ بلکہ مدینہ کی حفاظت کے لیے روک لیا جائے‘ کیونکہ عملاً مدینہ منورہ‘ مکہ مکرمہ اور طائف کے سوا کم وبیش باقی عرب باغی ہوگیا تھا۔ اندیشہ تھا کہ کسی وقت بھی قبائلِ عرب مدینہ پر حملہ کر دیں گے۔ تمام اندیشوں اور خدشات کو مسترد کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے جانشین نے لشکر کو حسب پروگرام روانہ کیا۔ لشکر کے سردار حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نوجوان ہیں‘ اپنی سواری پر ہیں اور بوڑھے خلیفۃ المسلمین ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اُن کی سواری کے ساتھ دوڑتے ہوئے آخری ہدایات دے رہے ہیں‘ وہ اترنا چاہتے ہیں لیکن خلیفہ کا حکم ہے کہ سواری سے مت اُترو۔ جو جھنڈا رسول اللہ ﷺ نے تمہارے ہاتھ میں دیا ہے اسے لے کر جاؤ‘ اور جہاد کرو۔ پھر یہ مشورہ بھی دیا گیا کہ مدعیانِ نبوت سے تو جنگ کی جائے مگر مانعینِ زکوٰۃ کو سردست نہ چھیڑا جائے‘ کیونکہ انہوں نے اسلام کا انکار نہیں کیا اور مصلحت کا یہ تقاضا بھی بتایا گیا کہ بیک وقت کئی محاذ کھولنا نقصان دہ ہوگا۔ لیکن جب ذمہ داری کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ اس نحیف وناتواں جسم اور بظاہر شفیق و رفیق انسان کے اندر عزم اور ارادے کا کوہِ ہمالیہ چھپا ہوا ہے۔ اور فی الحقیقت مقامِ صدیقیت کو جو قرب حاصل ہے مقامِ نبوت سے‘ یہ اُس کا پرتو تھا کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے جس انقلاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا‘ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تمام انقلاب مخالف قوتوں اور تحریکوں کی سرکوبی کر کے اُس انقلاب کو مستحکم ومجتمع (consolidate) کیا۔

توسیعِ انقلاب

توسیع انقلاب کا آغاز اور اُس کے خلاف ایران وروم کی عالمی طاقتوں کی طرف سے

اعلانِ جنگ تو نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ہی ہو چکا تھا‘ جبکہ جنگ موتہ اور غزوۂ تبوک کی صورت میں رُومیوں سے عملاً ٹکراؤ بھی شروع ہوگیا تھا۔ اور جیشِ اسامہؓ بھی اُنہی کے خلاف لشکر کشی کے لیے تیار کیا گیا تھا‘ کیوں کہ شام کے علاقے میں قیصر کے ایک باج گزار شیخ نے حضور ﷺ کے ایلچی کو شہید کر دیا تھا۔ البتہ ایرانیوں کے خلاف کوئی باقاعدہ فوج کشی حضور ﷺ کے زمانے میں نہیں ہوئی۔ خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب اندرونی شورشوں سے نمٹنے کے بعد توسیع انقلاب کی طرف توجہ کی تو آپؓ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا ایک لشکر تو ملک شام کی طرف روانہ کیا جو سلطنت روم کا باج گزار علاقہ تھا اور ایک لشکر عراق کی طرف بھیجا جو ایران کا باج گزار علاقہ تھا۔ لیکن زندگی نے آپؓ کو زیادہ مہلت نہ دی۔ سوا دو برس کے مختصر عہدِ خلافت صدیقی کے بعد جب اعزازِ خلافت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو منتقل ہوا تو تمام اندرونی فتنے ختم ہو چکے تھے اور توسیع انقلاب کا بھرپور آغاز ہو چکا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دس سالہ عہد خلافت میں اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے پہلے دس سالوں میں توسیع انقلاب کا عمل بھرپور طریقے سے جاری رہا۔ اس عمل کی نوعیت وکیفیت کا احاطہ کرنے کے لیے ملک عرب‘ جزیرہ نمائے عرب اور روم وایران کی سلطنتوں کی وسعت اور ان کا سیاسی وجغرافیائی خاکہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے۔ درحقیقت ملک عرب ایک مثلث نما علاقہ ہے۔ اس کا بڑا حصہ تو جزیرہ نمائے عرب کہلاتا ہے‘ جس کے نیچے جنوب کی طرف بحیرۂ عرب ہے اور مشرق میں خلیج فارس دور تک اوپر چلی گئی ہے۔ اسی طرح مغرب میں بحیرۂ احمر ہے اور خلیج عقبہ شمال مغرب کی طرف اوپر نکل گئی ہے‘ یوں یہ جزیرہ نما وجود میں آیا ہے کہ اس کے تین اطراف میں سمندر اور ایک طرف خشکی ہے۔ شمال میں خشکی کی طرف شامِ عرب‘ عراقِ عرب اور کردستان کا علاقہ مل کر مثلث کا ایک ضلع بناتے ہیں۔ جزیرہ نمائے عرب کا بیشتر حصہ تو صحراؤں اور پہاڑوں پر مشتمل ہے‘ اس لیے سلطنت روم یا سلطنت فارس میں سے کسی نے اسے اپنا مطیع بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ صرف یمن کا علاقہ چونکہ زرخیز تھا اس لیے وہاں ایران کا گورنر بازان موجود تھا۔ اسی طرح شام اور عراق کے علاقے جو اپنی زرخیزی

کی وجہ سے ہلالِ زرخیز (fertile crescent) بھی کہے جاتے ہیں‘ اپنی دو ہمسایہ عالمی قوتوں ایران و روم کے ساتھ وفاداری و باج گزاری کا تعلق قائم رکھتے تھے۔ عراق کی سرحدیں چونکہ سلطنت ایران سے ملحق تھیں اس لیے یہاں کے شیوخ اور مقامی سردار ایرانی حکومت کی سرپرستی سے قائم رہتے تھے‘ اور شام چونکہ سلطنت روما کی سرحد پر واقع تھا اس لیے وہاں کے مقامی عرب سردار اور شیوخ قیصر روم کے نامزد اور وفادار ہوتے تھے۔ روم کی بازنطینی سلطنت کے تین بڑے حصے تھے۔ ایک شمالی افریقہ‘ دوسرا مغربی ایشیاء یعنی شام اور ایشیائے کوچک کا علاقہ اور تیسرا حصہ یورپی علاقے پر مشتمل تھا۔

شہادتِ عمر فاروقؓ

حضرت عمرؓ کی خلافت کے دس سالوں میں حضور ﷺ کی پیشین گوئیوں کے مطابق ایران فتح ہوا اور کئی ہزار سالہ قدیم شاہی نظام نیست و نابود ہو گیا۔ سراقہ بن جعشمؓ کو‘ جنہوں نے سفرِ ہجرت کے دوران قریش کے اعلان کردہ انعام کے لالچ میں حضور ﷺ اور ابوبکر صدیقؓ کا تعاقب کیا تھا‘ کسریٰ کے کنگن پہنائے گئے(۱)۔ رومی سلطنت میں سے شام اور بیت المقدس کے علاقے اسلامی قلمرو میں شامل ہوئے۔ لیکن حضرت عمرؓ اپنی خلافت کے دسویں برس ایرانی نیشنلزم کے انتقام کا شکار ہو گئے۔ ایرانی شہنشاہیت کے خاتمے کے بعد ایرانی نیشنلزم اور شاہ پرستی کا جذبہ بھی ایک انقلاب مخالف قوت کی صورت میں سامنے آیا۔

چونکہ ایران حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں فتح ہوا اس لیے ایرانی قوم پرستوں کو سب سے زیادہ دشمنی حضرت عمرؓ کی ذات سے تھی۔ دوسرے انہوں نے خیال کیا کہ

(۱) سراقہؓ نے ہجرتِ مدینہ کے دوران حضور ﷺ کا تعاقب کیا تھا‘ لیکن دو بار ایسا ہوا کہ جیسے ہی وہ حضور ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کے قریب پہنچتا تھا اُس کے گھوڑے کی اگلی دونوں ٹانگیں ریت میں دھنس جاتی تھیں۔ چنانچہ وہ تائب ہو کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضور ﷺ نے مسکرا کر فرمایا کہ سراقہ میں تو تمہارے ہاتھ میں کسریٰ کے کنگن دیکھ رہا ہوں۔ اور یہ پیشین گوئی دورِ خلافت عمرؓ میں پوری ہوئی جب سلطنتِ کسریٰ کی دھجیاں بکھر گئیں اور واقعتاً کسریٰ کے کنگن سراقہؓ کو پہنائے گئے۔

حضور ﷺ کی قائم کی ہوئی جماعت اور حکومت شاید ایک ہی شخصیت کے بل پر کھڑی ہے‘ حالانکہ یہ ان کی غلط فہمی تھی۔ اسلامی نظام اور اسلامی حکومت ایک فرد کا معاملہ نہیں تھا۔ وہ ایک اجتماعی قوت تھی جس نے انقلاب برپا کیا تھا۔ ابھی وہ نیوکلیس (nucleus) اور وہ مرکزی قوت برقرار تھی۔ یہ وہ جماعت تھی جس کی تربیت خود اللہ کے رسول ﷺ نے کی تھی اور جن کی شان قرآن میں یوں بیان کی گئی ہے:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝١٠٠﴾ (التوبۃ)

’’وہ مہاجر و انصار جنہوں نے سب سے پہلے دعوتِ ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی‘ نیز وہ جو بعد میں راست بازی کے ساتھ اُن کے پیچھے چلے‘ اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے اور اللہ نے اُن کے لیے باغات مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔‘‘

اگر وہ جماعت مضبوط نہ ہوتی تو جزیرہ نمائے عرب میں جتنی بڑی قوتیں اٹھی تھیں وہ اسلام کا تیاپانچہ کرنے میں کامیاب ہو جاتیں اور اسلامی حکومت ختم ہو جاتی۔

حضرت عمرؓ کا قاتل ابولؤلؤ فیروز حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کا ایرانی النسل غلام تھا۔ اُس نے ایک بار حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ میرے مالک نے مجھ پر بہت زیادہ ٹیکس عائد کر رکھا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ تم کیا کیا فن جانتے ہو؟ جب اُس نے اپنے کام گنوائے تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ اگر تم اتنے ماہر کاریگر ہو تو یہ ٹیکس زیادہ نہیں ہے۔ گویا اُس کی اپیل خارج کر دی۔ ساتھ ہی حضرت عمرؓ نے کہا کہ سنا ہے تم چکّی بہت اچھی بناتے ہو‘ ایک چکّی ہمارے لیے بھی بنا دو۔ اُس نے جواب دیا: ’’آپ کے لیے تو میں ایسی چکّی بناؤں گا جو قیامت تک پیستی رہے گی‘‘۔ حضرت عمرؓ نے اسی وقت کہہ دیا کہ یہ شخص مجھے قتل کی دھمکی دے گیا ہے۔ یہاں یہ بات جان لیجیے کہ اسلام کے نظامِ عدل میں امتناعی نظر بندی (preventive detention) کا کوئی وجود نہیں۔ جب تک کسی نے جرم نہیں کیا آپ اُسے گرفتار نہیں کر سکتے۔ خلیفہ وقت خود کہہ رہا ہے کہ یہ شخص مجھے قتل کی دھمکی دے گیا

ہے۔ پھر یہ بات بھی بالکل واضح تھی کہ اُس کا تعلق ایک ایرانی جرنیل ہرمزان سے تھا۔ اُس نے خلیفہ اسلام پر جو حملہ کیا وہ قطعاً اُس کا ذاتی فعل نہیں تھا' درحقیقت یہ ایرانی سازش تھی اور ایرانی نیشنل ازم کا انتقام تھا۔

۲۶ ذوالحجہ ۲۲ ہجری کو نمازِ فجر کے دوران ابولؤلؤ فیروز نے زہر میں بجھے ہوئے خنجر سے حضرت عمرؓ پر چھ وار کیے۔ جب لوگوں نے اُسے پکڑنے کی کوشش کی تو کچھ کو زخمی کر کے اُس نے اُسی خنجر سے خودکشی کر لی۔ حضرت عمرؓ تین دن تک زخمی حالت میں زندہ رہے۔ تیسرے دن آپؓ کا انتقال ہوا۔ یکم محرم الحرام ۲۳ ہجری کو آپؓ کو دفن کیا گیا۔ حضرت عمرؓ کی شہادت سے یہ بات بہرحال ثابت ہوگئی کہ اسلامی انقلاب کی عمارت اتنی بودی نہیں ہے کہ ایک فرد کے ہٹنے سے ختم ہوجائے۔

فتنہ عظیم اور یہود کا کردار

حضرت عمرؓ کی جگہ حضرت عثمان غنیؓ خلیفہ ہوئے اور توسیعِ انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا عمل پورے زور شور سے جاری رہا۔ مصر' قبرص اور شمالی افریقہ کے علاقے فتح ہوئے۔ قیصرِ روم کی عیسائی سلطنت مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی لیکن اُس کے دو بہت بڑے علاقے اسلام کے زیرنگیں آ گئے۔ صرف ایشیائے کوچک میں ترکی کا علاقہ اور یورپ کا علاقہ باقی رہ گیا۔ کامل دس برس تک خلافتِ عثمانی بھی اسی شان سے قائم رہی جس شان پر حضرت عمرؓ نے اُسے پہنچایا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری دو سال کے دوران اندرونی طور پر ایک نیا فتنہ رونما ہوگیا' جس کو سب سے بڑا فتنہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ایک مصری مصنف نے ان واقعات پر جو کتاب لکھی ہے اُس کا نام ہی ''الفتنة الکبریٰ'' رکھا ہے۔ یہ بڑا فتنہ کیا تھا' اسے سمجھئے! جس طرح توسیع انقلاب کے نتیجے میں ایرانی سلطنت کا خاتمہ ہوا تھا اسی طرح جزیرہ نمائے عرب کے اندر انقلابی عمل کے دوران حضورﷺ نے ایک بڑی معاشی اور مذہبی قوت یعنی یہود کو زیر کیا تھا۔ حضورﷺ کی حیاتِ طیبہ میں مشرکین کے خاتمے کے ساتھ سب سے بڑی زک یہود کو پہنچی تھی۔ قرآن میں بھی یہود کو مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن کہا گیا ہے۔ مدینہ میں یہود کے تین قبیلے آباد تھے۔ ایک ایک کر کے انہیں وہاں

سے جلاوطن کیا گیا۔ بنوقریظہ کو بدعہدی پر یہ سزا دی گئی کہ اُن کے جتنے بھی مرد جنگ کے قابل تھے' اُنہیں قتل کر دیا گیا۔ یہ سب سے بڑی سزا تھی جو حضورﷺ کے دستِ مبارک سے یہودیوں کو ملی۔ مدینہ سے نکل کر جب یہ خیبر میں آباد ہوئے تو وہاں سے بھی انہوں نے مسلمانوں کے خلاف اپنی سازشیں جاری رکھیں' اس لیے حضورﷺ کو خیبر پر حملہ کر کے وہاں سے بھی انہیں نکالنا پڑا۔

اب پہچانیے کہ عرب کے اندر مذہبی طور پر سب سے زیادہ زخم خوردہ قوت یہود کی تھی۔ حضورﷺ کی زندگی میں عیسائیوں کے ساتھ تو کوئی مقابلہ ہوا ہی نہیں۔ عیسائیوں میں سے حضرت نجاشیؓ آپؐ پر ایمان لے آئے تھے اور اُن کے جانشین کو جب اسلام کی دعوت دی گئی تھی تو اس نے اگرچہ اسلام قبول نہیں کیا تھا لیکن حضورﷺ کے نامۂ مبارک اور ایلچی کا احترام واکرام کیا۔ نجران کے عیسائیوں کا وفد بھی حضورﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ جو عیسائی جزیرہ نمائے عرب میں آباد تھے وہ کبھی یہودیوں کی طرح نہ تو مسلمانوں کے خلاف کسی سازش یا مہم میں شریک ہوئے' نہ انہوں نے کسی معاندانہ سرگرمی میں حصہ لیا۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سب سے بڑھ کر انتقام کا جذبہ یہودیوں کے سینوں میں کھول رہا تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان کے اندر ایک لاوا پک رہا تھا اور وہ موقع کے منتظر تھے۔ اُن کی سازشی ذہانت کو تو آج بھی دُنیا مانتی ہے اور اُن کی سازشوں کے تانے بانے کو سمجھنے کے لیے بھی بڑی ذہانت درکار ہوتی ہے۔ وہ بظاہر بڑی معصوم اور بے ضرر قسم کی (روٹری انٹرنیشنل اور لائنز کلب جیسی) تنظیمیں قائم کرتے ہیں۔ بظاہر ان کے مقاصد بڑے پُرکشش اور پاکیزہ ہوتے ہیں اور اُن کی کشش میں ہمارے بھائی اُن میں شامل ہوتے ہیں۔ وہاں اُنہیں کچھ چودھراہٹیں ملتی ہیں' کچھ دُنیا میں گھومنے پھرنے کے مواقع میسّر آتے ہیں اور پھر یہود ان کے ذریعے اپنی سازشوں کے جال پھیلاتے ہیں۔

علامہ اقبال نے اپنے وقت میں برطانیہ کے حوالے سے جو بات کہی تھی کہ ؎ ''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!'' وہ آج امریکہ پر صادق آتی ہے۔ امریکہ میں حال ہی میں کانگریس کے ایک سابق ممبر نے اپنی کتاب ''They dare to speak out''

میں امریکی سیاست اور معاشرے پر یہودی کی گرفت کو بے نقاب کیا ہے۔ مصنف بائیس برس تک کانگریس کا ممبر رہا۔ اسرائیل کے خلاف ایک بیان دینے کی پاداش میں یہودیوں نے اُسے الیکشن میں شکست فاش دلوائی۔ لاس اینجلس کی صرف ایک یہودی پارٹی نے اُس کے خلاف تین ملین ڈالر چندہ دیا۔ اُس نے اپنی کتاب میں اُن تمام حربوں کو بے نقاب کیا ہے جن کے ذریعے یہود امریکی سیاست اور معیشت کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ جو شخص اسرائیل کے خلاف بات تک کرنے کی کوشش کرتا ہے‘ اپنے سرمائے اور اپنی سازشوں سے اُس کے سیاسی کیریئر کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ یہ کوئی دور از کار باتیں نہیں‘ آج کی متمدن دنیا کے قائد امریکہ کا ذکر ہے۔

عبداللہ بن سبا اور شہادتِ عثمان غنی رضی اللہ عنہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کے آخری دو برسوں میں ایرانی نیشنلزم کے ساتھ یہودی سازش کا یہ فتنہ بھی ملحق ہو گیا تھا۔ یمن کے ایک یہودی عبداللہ بن سبا نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اس سازش کا آغاز کیا۔ اُس نے مدینہ میں رہ کر حالات کا جائزہ لیا اور اُسے مسلمانوں کا ایک کمزور نکتہ مل گیا۔ قدیم قبائلی عصبیتوں کے جراثیم عرب کے مسلمان معاشرے کی سرشت میں اتنے گہرے اُترے ہوئے تھے کہ ان کے اثرات نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں بھی ظاہر ہو جاتے تھے۔ جب کوئی منافق کسی پرانے واقعہ کی یاد تازہ کر دیتا تھا تو اوس اور خزرج کے درمیان تلواریں نکل آتی تھیں۔ یہ تو حضور ﷺ کا وجودِ مبارک تھا جو فتنے کی آگ کو بھڑکنے نہیں دیتا تھا۔ آپ ﷺ کے انتقال کے بعد خوش قسمتی سے پہلے دونوں خلفاء کا تعلق قریش کے دو چھوٹے چھوٹے قبیلوں یعنی بنو تمیم اور بنو عدی سے تھا۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تعلق قریش کے بڑے اور بااثر خاندان بنو اُمیہ سے تھا جن کی پرانی مسابقت بنو ہاشم کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ یہودی ذہن نے اس دکھتی رگ کو تاڑ لیا تھا۔

مدینہ سے نکل کر عبداللہ بن سبا نے سب سے پہلا مورچہ بصرہ میں لگایا۔ اپنے ہم خیال لوگوں کی جمعیت پیدا کی اور اُن میں کچھ نئے عقائد پھیلانے شروع کیے۔ مثلاً اس نے کہا کہ کتنی عجیب بات ہے کہ مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تو یہ عقیدہ رکھتے ہیں

کہ وہ زندہ ہیں اور دوبارہ دُنیا میں آئیں گے جبکہ اپنے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے بارے میں سمجھتے ہیں کہ وہ فوت ہو گئے اور زیرِ زمین دفن ہیں۔ حالانکہ وہ بھی زندہ ہیں اور دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے۔ اس طرح اس نے مسلمانوں کے جذبۂ عشقِ رسول کو بھڑکا کر نہ صرف یہ کہ اپنے بارے میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ یہ شخص تو حضور ﷺ کا مداح‘ عاشق اور عقیدت مند ہے‘ بلکہ ایک باطل عقیدے کی بنیاد بھی رکھ دی۔ اسی طرح اُس نے دوسرا عقیدہ یہ پیش کیا کہ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے اور وہی نبی کا جانشین ہوتا ہے۔ اُس کے علاوہ کوئی دوسرا جانشین بن جائے تو اُس کی حیثیت غاصب کے سوا کچھ نہیں۔ حضور ﷺ کے وصی اور جانشین حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں‘ خلافت بھی اُنہی کا حق ہے۔ پہلے دونوں خلفاء بھی غاصب تھے اور سب سے بڑا غاصب تو موجودہ خلیفہ ہے۔ یہ تو ابتدائی باتیں تھیں‘ آخر میں اُس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں الوہیت کا یہ عقیدہ بھی پیش کیا کہ حضرت علی تو دراصل مظہرِ خدا ہیں‘ اللہ اُن کے اندر حلول کر گیا ہے۔ وہی God incarnate یعنی تجسیمِ رب کا قدیم مشرکانہ عقیدہ اُس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں پھیلانا شروع کر دیا۔

ان عقائد کی تشہیر کے ساتھ ساتھ اُس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سیاسی پروپیگنڈے کی ایک باقاعدہ مہم چلائی کہ وہ کنبہ پرور ہیں‘ بیت المال میں خیانت کرتے ہیں اور اپنے رشتہ داروں کو نوازتے ہیں‘ وقِس علٰی ھٰذا! جب بصرہ کے گورنر ابن عامر نے اُس کی سرگرمیوں کا نوٹس لیا تو وہ وہاں سے کوفہ چلا گیا۔ لیکن اُس کے ہم خیال لوگوں کی ایک معقول تعداد بصرہ میں پیدا ہو چکی تھی جو اُس کے نظریات کو پھیلانے کے لیے کافی تھی۔ کوفہ ایک نیا شہر تھا جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایران کی سرحد پر فوجی چھاؤنی کے طور پر آباد کیا تھا۔ یہاں پر ایرانی نیشنل ازم‘ شاہ پرستی اور یہودی سازش کا ملاپ ہوا اور کوفہ میں عبداللہ بن سبا کے نظریات کو خوب پذیرائی ملی‘ بہت سے لوگ اُس کے پیروکار بن گئے۔ جب کوفہ کے گورنر سعید بن العاص نے اُس سے باز پرس کی تو وہ دمشق پہنچ گیا۔ وہاں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے زیرک صحابی موجود تھے۔ وہاں اُس کی دال نہیں گلی تو وہاں سے مصر چلا گیا

اور مصر میں اُس نے اپنا اڈہ بنا لیا۔ ہر صوبے میں دوسرے صوبے کے گورنر کے خلاف پروپیگنڈا اور افواہ سازی کا ایک سلسلہ قائم کر کے اُس نے لوگوں میں ایک عام بے اطمینانی کی فضا پیدا کر دی۔

پروپیگنڈے کی اس شاطرانہ ترتیب کو ذہن میں رکھیے۔ اُس دور میں ذرائع ابلاغ موجود نہیں تھے‘ تار نہیں‘ ٹیلیفون نہیں‘ ڈاک کا کوئی لمبا چوڑا انتظام نہیں۔ آج سائنس اور ترقی کے دور میں بھی حال یہ ہے کہ افواہوں کے بل پر بڑے بڑے فتنے پیدا ہو جاتے ہیں تو اُس دور کے حالات کو قیاس کر لیجیے۔ افواہ کا ایک اپنا فلسفہ ہوتا ہے۔ انسان کی فطری کمزوری ہے کہ وہ اچھی بات کی نسبت بُری بات کو ذرا کان لگا کر سنتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب منافقین نے حضرت عائشہ صدیقہ ؓ پر تہمت لگائی تو اس دور میں جبکہ اللہ کے رسول ﷺ بنفسِ نفیس مسلمانوں کے درمیان موجود تھے‘ بہت سے مخلص مؤمنین بھی منافقوں کی اس سازش کا شکار ہو گئے۔

قصہ مختصر یہ کہ حضرت عثمان ؓ کے خلاف عبداللہ بن سبا کی سازش کامیاب ہو گئی۔ (جو حضرات واقعات کی تفصیل جاننا چاہتے ہیں وہ میرے کتابچے ’’شہید مظلوم‘‘ کا مطالعہ کریں۔) پروپیگنڈا کی مہم کے نتیجے میں مختلف صوبوں سے آئے ہوئے بلوائیوں نے مدینۃ الرسول میں خلیفۃ المسلمین‘ امیر المؤمنین حضرت عثمان غنی ؓ کو انتہائی مظلومیت کے عالم میں شہید کر دیا۔ بلوائیوں نے پچاس روز تک آپؓ کے گھر کا محاصرہ کیے رکھا۔ حضرت عثمان ؓ کو اُس کنویں کے پانی سے بھی محروم کر دیا جسے عہدِ رسالت میں انہوں نے خرید کر اہلِ مدینہ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ جس طرح حضرت عمر ؓ نے اپنے قاتل ابولؤلؤ فیروز کے خلاف کوئی امتناعی اقدام نہیں کیا تھا‘ اسی طرح حضرت عثمان ؓ نے بھی بلوائیوں کے خلاف کسی قسم کے فوجی اقدام کی ممانعت کر دی۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنی جان بچانے کے لیے کسی کلمہ گو کا خون بہانے کو تیار نہیں ہوں۔ حضرت عثمان ؓ کے اس موقف سے کوئی اختلاف کرنا چاہے تو کرے‘ میں تو اِسے اُن کی عزیمت کا بہت بڑا ثبوت سمجھتا ہوں۔ ایرانیوں کی نسل پرستانہ ذہنیت اور یہود کی منتقمانہ سازشوں نے مل کر وہ حالات پیدا کیے جو

حضرت عثمان ؓ کی شہادت پر منتج ہوئے اور پھر خانہ جنگی اور فتنے کے اُس دور کا آغاز ہوا جس میں قریباً ایک لاکھ مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں کا نشانہ بنے۔

شہادتِ حضرت علی مرتضیٰ ؓ

حضرت عثمان ؓ کے بعد حضرت علی ؓ خلیفہ بنے۔ بدقسمتی سے اُن کا پورا عہدِ خلافت باہمی خانہ جنگی میں گزر گیا۔ حضرت علی ؓ نے مدینہ منورہ سے دارالحکومت کوفہ منتقل کر دیا۔ کوفہ عبداللہ بن سبا کے پیروکاروں کا ایک بہت بڑا مرکز تھا۔ وہاں سبائیوں نے حضرت علی ؓ کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ جب بھی صلح کی نوبت آئی انہوں نے اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے جنگ شروع کروا دی۔ ’’نہج البلاغہ‘‘ میں حضرت علیؓ کے خطبات پڑھ لیجیے کہ وہ اپنے ساتھیوں کو کس طرح لعن طعن کرتے ہیں۔ وہ حضرت علی ؓ کا حکم مانتے ہی نہیں تھے۔ حضرت امیر معاویہ‘ حضرت زبیر‘ حضرت طلحہ اور حضرت عائشہ صدیقہ ؓ میں سے کوئی بھی خلافت کا مدعی نہیں تھا۔ سب کا مطالبہ یہی تھا کہ حضرت عثمان ؓ کے قاتلوں سے قصاص دلوایا جائے۔ جنگ جمل کے موقع پر حضرت علی اور حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کے درمیان صلح ہو رہی تھی‘ تقریباً بات طے ہو چکی تھی۔ حضرت علیؓ نے اعلان کر دیا تھا کہ جو لوگ حضرت عثمانؓ کے خون میں براہِ راست ملوث ہیں وہ علیحدہ ہو جائیں۔ اُس وقت سبائیوں میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ وہاں اُن کے لیڈر عبداللہ بن سبا اور مالک اشترنخعی بھی موجود تھے۔ دونوں نے سازش کر کے رات کی تاریکی میں حضرت عائشہ ؓ کے لشکر پر حملہ کر دیا تھا اور افواہ اڑا دی تھی کہ حملہ حضرت علی ؓ کے لشکر کی طرف سے ہوا ہے۔ بہرحال صلح ہوتے ہوتے جنگ چھڑ گئی اور دونوں طرف سے دس ہزار مسلمان تہ تیغ ہوئے۔

اسی طرح ایک موقع پر ابومسلم خولانی حضرت علی ؓ کے پاس امیر معاویہ ؓ کا تحریری پیغامِ صلح لے کر آئے۔ امیر معاویہؓ نے لکھا کہ آپ سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں‘ آپ کی خلافت سے ہمیں انکار نہیں‘ ہم بیعت کرنے کو تیار ہیں‘ آپ صرف قاتلینِ عثمانؓ کو ہمارے حوالے کر دیں۔ حضرت علیؓ نے جب کوفہ کی جامع مسجد میں امیر معاویہؓ کے سفیر کی موجودگی میں پیغامِ صلح پڑھ کر سنایا تو دس ہزار مسلح کوفیوں نے کھڑے ہو کر بیک زبان کہا

کہ ’’ہم سب عثمانؓ کے قاتل ہیں‘ لو ہم سے بدلہ‘‘۔ حضرت علیؓ بے بس ہو گئے۔ بالآخر حضرت علی اور حضرت معاویہ ؓ کے درمیان صفین کے مقام پر شدید جنگ ہوئی اور دونوں طرف سے ۶۴ ہزار مسلمان کام آئے۔ یہ صرف ایک جنگ میں تہِ تیغ ہونے والوں کی تعداد ہے ورنہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان جنگوں کے سلسلے میں مزید خونریزی بھی ہوئی۔ جنگ صفین کے دوران جب حضرت علی ؓ نے ثالثی کی تجویز قبول کر لی تو انہی سبائیوں کا ایک حصہ باغی ہو کر حضرت علیؓ کے لشکر سے علیحدہ ہو گیا‘ جو بعد میں خارجی کہلایا۔ خوب جان لیجیے! یہ خارجی کون تھے؟ یہ حضرت علیؓ کے لشکر سے نکلے ہوئے سادہ لوح لوگ تھے جو سبائی پروپیگنڈے کے زیر اثر تھے۔ جب یہ لوگ آمادۂ فساد ہوئے تو حضرت علیؓ کو ان سے بھی جنگ کرنا پڑی۔ صرف نہروان کی جنگ میں چار ہزار خارجی قتل ہوئے۔ انہوں نے ’تحکیم‘ قبول کرنے پر حضرت علی‘ حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص ؓ جیسے برگزیدہ اصحابِ رسولؐ کو کافر‘ مرتد اور واجب القتل قرار دیا۔

تین خارجیوں نے ایک معاہدے اور منصوبے کے تحت رمضان کی پندرہ تاریخ کو تینوں بزرگوں پر بیک وقت قاتلانہ حملے کیے۔ اللہ کی تقدیر کا فیصلہ ہے۔ حضرت معاویہؓ پر وار اوچھا پڑا‘ معمولی زخم آئے جو چند روز میں مندمل ہو گئے۔ حضرت عمروؓ بن العاص علیل تھے‘ اس روز نماز پڑھانے مسجد میں تشریف ہی نہیں لائے۔ اُن کی جگہ جس نے امامت کی‘ وہ لقمۂ اجل بن گیا۔ لیکن حضرت علیؓ کی پیشانی پر ابن ملجم کے زہر میں بجھے ہوئے خنجر کا وار کاری ثابت ہوا۔ اب دیکھئے حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ بھی سبائیوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ آخری وقت میں حضرت علیؓ سے لوگوں نے پوچھا کہ ہم حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کر لیں؟ حضرت علی ؓ نے بالکل صاف اور درست جواب دیا کہ میں نہ تمہیں اس کا حکم دیتا ہوں‘ نہ اس سے منع کرتا ہوں۔ اگر تم حسنؓ کو خلافت کا اہل سمجھتے ہو تو بیعت کر لو۔ لیکن صرف میرا بیٹا ہونے کی وجہ سے میں یہ نہیں کہتا کہ ضرور اُس کے ہاتھ پر بیعت کرو۔

حضرت حسنؓ کا مصالحانہ کردار اور خانہ جنگی کا اختتام

بہرحال لوگوں نے حضرت حسن ؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ آپؓ چھ ماہ خلیفہ

رہے۔ حضرت معاویہؓ اور حضرت عمروؓ بن العاص نے نہ حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی نہ حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حضرت علی ؓ کے دورِ خلافت میں عالمِ اسلام متحد نہیں ہوا۔ توسیع انقلاب کا عمل رک گیا اور تلواریں اپنوں ہی کے خون سے رنگین ہوتی رہیں۔ حضرت حسنؓ حضرت معاویہؓ کے خلاف لشکر لے کر نکلے تو راستے میں افواہ اُڑ گئی کہ حضرت حسنؓ کے لشکر کے ہراول دستے کو شکست ہو گئی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت حسنؓ کے اپنے ساتھی اُن کی جان کے درپے ہو گئے اور اُنہیں راستے میں مدائن میں کسریٰ کے ایک پرانے محل میں پناہ لے کر جان بچانی پڑی۔ اُن کے ساتھی کون تھے؟ وہی سبائی وہی کوفی۔ حضرت حسنؓ اُن کی حقیقت کو خوب جان گئے تھے اور آپؓ کو اُن لوگوں کے کردار کا تجربہ ہو گیا تھا۔ ان حالات میں حضرت حسنؓ نے امیر معاویہؓ کی صلح کی پیش کش کو فوراً قبول کر لیا۔ حضرت حسن ؓ کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کی پیش گوئی بھی موجود تھی کہ ’’میرے اس بیٹے کے ذریعے اللہ ایک وقت میں مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان صلح کرا دے گا۔‘‘

یہ ۴۱ھ کی بات ہے۔ امیر معاویہؓ نے حضرت حسنؓ کو شرائط صلح طے کرنے کا پورا اختیار دے دیا۔ آج کی اصطلاح میں گویا بلینک چیک (blank cheque) دے دیا گیا۔ چنانچہ حضرت حسنؓ نے چار شرائط پیش کیں جنہیں امیر معاویہؓ نے من و عن تسلیم کر لیا۔ پہلی شرط یہ تھی کہ عام معافی ہو گی۔ اب تک دونوں طرف سے جنگوں میں جو کچھ ہوا اس پر کسی سے کوئی مؤاخذہ نہیں ہو گا۔ دوسری شرط یہ طے ہوئی کہ ایران کے صوبہ اہواز کا سالانہ خراج حضرت حسنؓ کو ملے گا۔ تیسری شرط یہ تھی کہ میرے بھائی حسینؓ کو سالانہ ۲۰ ہزار درہم وظیفہ دیا جائے گا۔ چوتھی اور آخری شرط یہ تھی کہ بنی ہاشم کو مسلمانوں کے دوسرے قبائل سے زیادہ وظیفہ دیا جائے گا۔ صلح کے بعد حضرت حسن ؓ نے اعلان کر دیا کہ اگر خلافت امیر معاویہؓ کا حق تھی تو انہیں پہنچ گئی اور اگر میرا حق تھی تو میں اُن کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ اس اعلان کے بعد حضرت معاویہؓ نے بیعت خلافت لی اور اس طرح اُس پانچ سالہ خانہ جنگی کا خاتمہ ہوا جس میں ایک لاکھ مسلمان ایک دوسرے کے نیزوں اور تلواروں سے قتل ہوئے تھے۔

امیر معاویہؓ کا عہدِ حکومت

آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس صلح پر یہودیوں اور سبائیوں کی متحدہ انقلاب مخالف تحریک کو کس قدر صدمہ پہنچا ہوگا۔ تاریخ کی یہ عجیب حقیقت سامنے آتی ہے کہ ۴۱ھ سے ۶۰ھ تک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بیس سالہ عہد حکومت میں کوئی خانہ جنگی‘ کوئی بغاوت‘ کوئی فتنہ وفساد‘ کوئی اختلاف رونما نہ ہوا۔ تاریخِ اسلام میں خلافت راشدہ کے تیس سالہ دَور کے بعد یہ بیس سالہ دَور بھی مسلمانوں کا بہترین دور تھا۔ توسیعِ انقلاب کا جو عمل اندرونی سازشوں‘ خلفشار‘ خانہ جنگی اور فتنہ وفساد کے نتیجے میں بالکل رُک گیا تھا‘ پھر سے اُس کا آغاز ہوا۔ گویا ع ''ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا''۔ مسلمان پھر سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر نکل کھڑے ہوئے۔ قیصر کا دار السلطنت قسطنطنیہ جو ابھی تک فتح نہیں ہوا تھا‘ اُس پر فوج کشی کی گئی‘ جس کے بارے میں صحیح بخاری کی روایت میں یہ بشارت موجود ہے کہ اس جہاد میں شامل ہونے والے ''مغفورٌ لھم'' ہیں۔ اس لشکر میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ میز بانِ رسولؐ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے اسی روایت کا مصداق بننے کے لیے ۹۰ سال کی عمر میں پالکی میں سوار ہو کر اتنا طویل سفر کیا۔ وہاں آپؓ کا انتقال ہوا۔ آپؓ نے وصیت کی کہ مجھے دشمن کے علاقے میں شہر پناہ کے جس قدر قریب دفن کر سکتے ہو کرنا۔ آج بھی قسطنطنیہ میں اُن کی قبر موجود ہے۔ البدایہ والنہایہ میں حافظ ابن کثیر کی نقل کردہ روایت کے مطابق اس لشکر کا سپہ سالار امیر معاویہؓ کا بیٹا یزید تھا۔ بہرحال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا بیس سالہ عہد فتنہ پروروں اور سازشیوں کے لیے سخت نا مساعد عہد تھا۔ وہ حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لگائے ہوئے جس پودے کو جڑ سے اُکھاڑنے کے لیے سازشیں کر رہے تھے‘ وہ پھل پھول رہا تھا‘ ملک میں امن وامان تھا۔ مملکت کی سرحدیں وسیع ہو رہی تھیں۔ اس بیس سالہ دور میں ایک اختلافی معاملہ پیش آیا یزید کی ولی عہدی کا۔ اس پر گفتگو ان شاءاللہ اگلے جمعہ کو ہوگی۔

اقول قولی ھٰذا واستغفر اللہ لِی ولکم ولِسَائِرِ المسلمین والمُسْلِمَات ○○

[نوٹ: ''یزید کی ولی عہدی اور سانحہ کربلا کا تاریخی پس منظر'' کے عنوان سے کی گئی ڈاکٹر صاحبؒ کی گفتگو اگلے شمارے میں ملاحظہ کریں!]

سلسلہ وار دروسِ قرآن (۲۲)

انقلابِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا اساسی منہج

سورۃ الجمعہ کی روشنی میں

شجاع الدین شیخ ☆

سورۃ الجمعہ کا موضوع حکمت و اَحکامِ جمعہ ہے اور اس سورت میں غلبۂ دین کے لیے نبی اکرم ﷺ کا اساسی منہج اور طریقۂ کار بھی بیان ہوا ہے جو اس سورت کا مرکزی مضمون ہے۔ سب سے پہلے اس سورت کی آیات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ آیات ۱ تا ۴ میں اجتماعِ جمعہ کی حکمت‘ قرآن حکیم کے پڑھنے‘ پڑھانے اور اس کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ آیات ۵ تا ۸ میں تورات سے متعلق یہود کا ذمہ داریوں سے اعراض اور اس کی وجہ کا ذکر ہے‘ تاہم یہ تذکرہ ہم مسلمانوں کی عبرت کے لیے بھی ہے۔ آیات ۹ تا ۱۱ میں اَحکام و آدابِ جمعہ کا بیان ہے۔

چار صفات اور چار ذمہ داریاں

پہلی آیت میں ارشاد ہوا:

﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۱﴾

’’پاکی بیان کرتی ہے (اور کرتی رہے گی) اللہ کی ہر وہ شے جو آسمانوں اور زمین میں ہے جو کہ بادشاہ‘ پاکیزہ ذات‘ زبردست‘ حکمت والا ہے۔‘‘

تسبیح سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر کمی‘ ہر عیب‘ ہر نقص‘ ہر احتیاج اور ہر کمزوری سے پاک ہے۔ اس آیت میں بیان کردہ اللہ تعالیٰ کی چار صفات کا اگلی آیت میں بیان کردہ نبی اکرم ﷺ کی چار شانوں سے حسین ربط ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پہلی صفت اَلْمَلِكِ بمعنی بادشاہ حقیقی آئی تو اگلی آیت میں

☆ معاون برائے مرکزی شعبہ تعلیم و تربیت‘ تنظیم اسلامی

اس کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کی یہ ذمہ داری بیان کی گئی کہ آپؐ اس بادشاہ حقیقی کی آیات لوگوں پر پڑھ کر سناتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی دوسری صفت اَلْقُدُّوْسِ بمعنی پاکیزہ ترین ہستی آئی تو اس کے مقابلے میں اگلی آیت میں نبی اکرم ﷺ کی یہ ذمہ داری بیان کی گئی کہ آپ ﷺ اللہ کے بندوں کو پاکیزہ بناتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تیسری صفت اَلْعَزِيْزِ بمعنی زبردست بیان ہوئی تو اگلی آیت میں نبی کریم ﷺ کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ اس زبردست ذات کے اَحکام لوگوں کو سکھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی آخری صفت جو اس آیت میں بیان ہوئی وہ اَلْحَكِيْمِ بمعنی کمال حکمت والا ہے تو اگلی آیت میں بتایا گیا کہ نبی کریم ﷺ اس کی عطا کردہ حکمت کی تعلیم لوگوں کو دیتے ہیں۔ یہ حسین ربط ہے اللہ تعالیٰ کی صفات اور حضور اکرم ﷺ کی ذمہ داریوں میں۔

انقلابِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی شان اور اس کے مراحل

آیت ۲ میں ارشاد ہوا:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۤ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۲﴾

’’وہی ہے (اللہ) جس نے اُمیین میں ایک رسول (ﷺ) اٹھایا انہی میں سے جو ان کو اُس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے۔ اور یقیناً اس سے پہلے تو یہ لوگ کھلی گمراہی میں تھے۔‘‘

یہ آیت اس سورۃ کا عمود ہے جس میں غلبۂ دین کے لیے نبی کریم ﷺ کے اساسی طریقہ کار کو واضح کیا گیا ہے۔ انقلابِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی دو بے مثال شانیں ہیں: ایک تو یہ کہ آپ ﷺ کا برپا کردہ انقلاب ایک ہمہ گیر انقلاب تھا جس نے انسانی زندگی کے انفرادی واجتماعی تمام گوشوں کو یکسر بدل کر رکھ دیا اور دوسرا یہ کہ نبی کریم ﷺ نے صرف ایک ہی life span میں اور ۲۱ برس کے مختصر عرصے میں انقلاب برپا کر دیا — تاریخ میں اور بھی انقلاب آئے‘ مثلاً فرانس میں سیاسی سطح پر اور روس میں معاشی سطح پر انقلاب آیا‘ لیکن نبی کریم ﷺ نے جو انقلاب برپا کیا‘ اس طرح کی کوئی اور مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی کہ اس میں دعوت‘ تنظیم‘ تربیت کے مراحل سے گزر کر انقلاب برپا کرنے والے آپ ﷺ ہی تھے۔ دوسرے انقلابات میں یہ ہوا کہ

انقلابی نظریے پر مبنی کتاب کسی نے لکھی، محنت کسی اور نے کی، تحریک کسی اور نے چلائی اور انقلاب کسی اور کی زندگی میں آیا۔ ایسا بھی ہوا کہ داعیٔ انقلاب کہیں پیدا ہوا اور انقلاب اس کی موت کے بعد کسی اور ملک میں برپا ہوا۔ اگر انقلابی طریقۂ کار کو سمجھنے کی ضرورت ہو تو اس کی واحد اور کامل مثال رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ بابرکات ہے۔

اب ہم سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں انقلاب کے چھ مراحل کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلا مرحلہ ''دعوت'' کا ہے یعنی جاری باطل نظام کو ختم کر کے انقلاب برپا کرنے کے لیے سب سے پہلے دعوت پیش کرنا ہو گی۔ حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کا انقلابی نظریہ اور توحید کا انقلابی نعرہ لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ آج بھی اگر کوئی انقلابی تحریک برپا کرنا چاہے تو اسی طریقۂ کار کو سامنے رکھنا ہو گا۔ دوسرا مرحلہ ''تنظیم'' یعنی دعوت قبول کرنے والوں کو منظم کرنا ہے۔ تیسرا مرحلہ ''تربیت'' یعنی دعوت قبول کرنے والوں کی انقلاب کی نوعیت کے اعتبار سے تربیت کرنا ہے۔ اگر اللہ کا نظام زمین پر قائم کرنا ہے تو تربیت اللہ والوں کے اعتبار سے کی جائے گی۔ چوتھا مرحلہ ''صبرِ محض'' یعنی مناسب قوت کی فراہمی تک ہر طنز و تشدد کے مقابلے میں جوابی اقدام کیے بغیر اپنے موقف پر ڈٹے رہنا ہے۔ مکّی زندگی کے ۱۳ برس رسول اللہ ﷺ نے دعوت پیش کی لیکن جوابی کارروائی کے لیے ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں دی، اس لیے کہ ابھی ایک انقلابی جماعت تیار کرنی ہے اور دعوت کو پھیلانا ہے، معاشرے کے افراد کی ہمدردی حاصل کرنی ہے۔ لہٰذا عجلت میں کوئی ردِّعمل نہ دکھایا جائے، بلکہ صبر کے ساتھ برداشت کیا جائے۔ ہر مخالفت کو جھیلا جائے لیکن اپنے موقف پر استقامت کے ساتھ ڈٹا رہا جائے۔

اگلا مرحلہ ''اقدام'' کا ہے، یعنی مناسب قوت و اسباب فراہم ہوتے ہی باطل نظام کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑنا۔ رسول اللہ ﷺ کو ہجرت کے بعد اجازت دی گئی تو آپ ﷺ نے آگے بڑھ کر قریشِ مکہ کی لائف لائن یعنی تجارتی شاہراہ پر چھاپہ مار دستے بھیجنے شروع کیے، بالآخر معرکۂ بدر پیش آیا اور اگلے مرحلے یعنی ''مسلح تصادم'' کا آغاز ہوا۔ اقدام کے نتیجے میں باطل نظام کی طرف سے ردِّعمل کا پامردی سے مقابلہ کیا گیا۔ اس طریقہ کار کے ذریعے نبی اکرم ﷺ نے تاریخِ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا کیا۔ آج بھی اگر ہم نے اسلامی انقلاب کے لیے جِدّ و جُہد کرنی ہے تو اسی طریقہ کار کو اختیار کرنا ہو گا۔

انقلابی عمل کی پشت پر کارفرما بنیادی طریقہ کار کو اس سورت کی آیت ۲ میں بیان کیا گیا ہے۔ اسی طریقے کے ذریعے نبی اکرم ﷺ نے وہ افراد تیار کیے جنہوں نے بے مثال قربانیاں پیش کر کے اقامت دین کی منزل سر کی۔ آیت زیر نظر میں بیان شدہ مضمون کی اہمیت کو قرآن حکیم میں چار باریکساں اصطلاحات کے ساتھ بیان کر کے واضح کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۱۲۹ میں حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی دعا نقل کی گئی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے دعا کی قبولیت کا بیان آیت ۱۵۱ میں ہوا۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۶۴ میں مؤمنوں پر رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے طور پر اللہ تعالیٰ کے احسان کا ذکر آیا اور سورۃ الجمعہ کی آیت ۲ میں مرکزی مضمون کے طور پر اسے بیان کیا گیا۔

اس آیت میں وارد شدہ اصطلاح الْاُمِّیّٖن کے معنی کی وضاحت ضروری ہے۔ اُمِّی (یعنی بطن مادر سے برآمد ہونے والا) کی جمع اُمِّیّٖن (یعنی پڑھنے لکھنے کی صلاحیت سے محروم) ہے۔ یہ لفظ قرآن حکیم میں اصطلاحی طور پر اہلِ کتاب کے مقابلے میں مشرکینِ عرب کے لیے آیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی چار ذمہ داریاں

اب ان چار اصطلاحات کو جو رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داریوں کے حوالے سے بیان ہوئی ہیں، سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلی بات ہے: تلاوتِ آیات، یعنی آپ ﷺ لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت فرما کر ان کے قلب میں موجود ایمان کو تازہ اور شعوری سطح پر اُجاگر فرماتے ہیں۔ آپ ﷺ کا دوسرا فریضہ ہے: تزکیہ، یعنی آپ ﷺ ایمان لانے والوں کا تزکیہ کرتے ہیں اور ان کے قلوب و اذہان کو غلط نظریات اور نفسانی امراض سے پاک کرتے ہیں۔ تزکیہ عقل کا بھی ہو گا اور دل کا بھی، کیونکہ عقل میں غلط فکر آتی ہے اور دل میں غلط خیالات اور اُمنگیں آجاتی ہیں۔ تیسرا فریضہ تعلیم کتاب ہے۔ کتاب کا لفظ قرآن کریم کے لیے بھی آتا ہے اور حکم یا احکامات کے لیے بھی۔ آیت زیر مطالعہ میں لفظ تلاوت بھی آیا اور تعلیم بھی۔ تلاوت کا معنی ہے: قرآن حکیم کے الفاظ کو پڑھنا، جبکہ تعلیم کا معنی ہے: علم سکھانا۔ رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری محض تلاوت ہی نہیں بلکہ احکام کی وضاحت بھی تھی۔ چوتھی ذمہ داری تعلیم حکمت ہے یعنی مختلف امور کی حکمت سے آگاہ کرنا۔ اس کے ذریعے انسان ہر عمل کی غرض و غایت سمجھ جاتا ہے۔ یہی اصلاح کا فطری طریقہ ہے۔

فرد کی اصلاح کے لیے کسی حکم پر عمل سے پہلے قلب کی صفائی ضروری ہے۔ معاشرے کی

اصلاح معاشرے کے ذہین عناصر کے فکر ونظر کو بدلے بغیر ممکن نہیں۔ آج بھی اگر ہم معاشرے کی اصلاح چاہتے ہیں تو ہمیں بھی قریہ قریہ' بستی بستی قرآن حکیم کے احکامات کو لوگوں تک پہنچانا ہے۔ جس طرح دماغ جسم کا ایک چھوٹا حصّہ ہوتا ہے لیکن یہ پورے جسم کو کنٹرول کرتا ہے' اسی طرح معاشرے کے ذہین وفطین لوگوں کا ایک چھوٹا سا گروہ پورے معاشرے کو کنٹرول کرتا ہے۔ اس گروہ کے ذہن کو متاثر کرنے اور اس کو پاک کرنے کی ضرورت ہے۔ سورۃ الجمعہ میں خطبہ کا بھی ذکر ہے اور نبی اکرم ﷺ خطبہ جمعہ میں قرآن حکیم کی تلاوت فرماتے اور اس کے ذریعے وعظ ونصیحت فرمایا کرتے تھے۔ حضور ﷺ اپنی تمام ذمہ داریاں قرآن حکیم کی بنیاد پر ہی ادا فرماتے تھے۔

حضرت محمد ﷺ اور اُمتِ محمد پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل

اب آگے چلتے ہیں' آیت ۳ میں ارشاد ہوا:

﴿وَّاٰخَرِيۡنَ مِنۡهُمۡ لَمَّا يَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ‌ؕ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۝۳﴾

''اور انہی میں سے کچھ دوسرے لوگوں میں بھی جو ابھی ان (اُمّیین) میں شامل نہیں ہوئے۔ اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔''

نبی کریم ﷺ کی بعثت کے دو رُخ ہیں۔ بعثت خصوصی اُمّیین یعنی اہل عرب کی طرف ہے جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا اور بعثت عمومی قیامت تک آنے والے دنیا کے تمام انسانوں کی طرف ہے۔ اٰخَرِيۡنَ مِنۡهُمۡ سے یہ حقیقت ظاہر ہو رہی ہے کہ اُمّتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں اُمّیین کے ساتھ آخرین بھی شامل ہیں اور ان دونوں سے مل کر اُمّتِ مُسلمہ وجود میں آئی ہے۔

آیت ۴ میں ارشاد ہوا:

﴿ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ‌ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ ۝۴﴾

''وہ اللہ کا فضل ہے' جسے وہ چاہتا ہے دے دیتا ہے' اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔''

اللہ کا سب سے بڑا فضل نبی کریم ﷺ پر ہوا جس کا بیان سورۂ بنی اسرائیل میں آیا: ﴿اِنَّ فَضۡلَهٗ كَانَ عَلَيۡكَ كَبِيۡرًا ۝۸۷﴾ ''بیشک (اے نبی ﷺ!) آپ پر تو اللہ کا بہت بڑا فضل ہے''۔ ع ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر''۔ اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے بڑی ہستی رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو خیر امت قرار دیا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اس کے سپرد کیا۔ آپ ﷺ تمام انبیاء کے آخر میں آئے اور

ہم آخری اُمت ہیں۔ اس حوالے سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَنَا آخِرُ الْاَنْبِیَاءِ وَاَنْتُمْ آخِرُ الْاُمَمِ)) (المعجم الکبیر للطبرانی والمستدرک للحاکم) ''میں آخری نبی ہوں اور تم آخری امت ہو''۔ یہ ہمارے لیے سعادت کی بات ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے اُمتی ہیں۔ سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہوا: ﴿كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ﴾ (آیت ۱۱۰) ''تم بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کے لیے برپا کیا گیا ہے' تم نیکی کا حکم دو گے اور بدی سے روکو گے''۔ یہ ہمارا فریضہ ہے جسے ہم نے انجام دینا ہے۔ بیہقی کی روایت کے مطابق اس فریضہ کی ادائیگی کا ذریعہ قرآن مجید ہے۔ قرآن کی تبلیغ کے حوالے سے حضور ﷺ نے یہ فرما کر ہمارے لیے سہولت کا سامان پیدا کر دیا: ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً)) (رواہ البخاری) ''پہنچاؤ میری جانب سے چاہے ایک ہی آیت ہو''۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

یہود کا طرزِ عمل' مسلمانوں کے لیے عبرت

سورۃ الجمعہ کی آیات ۵ تا ۸ میں تورات سے متعلق یہودیوں کا اعراض اور اس کی وجہ بیان کی گئی ہے۔ قرآن کے تعلق سے ہمیں عبرت دلائی جارہی ہے کہ یہود نے تورات کے ساتھ جو حرکت کر ڈالی' تم قرآن کے ساتھ یہ نہ کرنا —— آیت ۵ میں ارشاد ہوا:

﴿مَثَلُ الَّذِيۡنَ حُمِّلُوا التَّوۡرٰٮةَ ثُمَّ لَمۡ يَحۡمِلُوۡهَا كَمَثَلِ الۡحِمَارِ يَحۡمِلُ اَسۡفَارًا‌ ؕ بِئۡسَ مَثَلُ الۡقَوۡمِ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ‌ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ۝۵﴾

''مثال ان لوگوں کی جن پر تورات کی ذمہ داری ڈالی گئی پھر انہوں نے اس ذمہ داری کو نہ نبھایا' مثال اس گدھے کی سی ہے جس نے کتابوں کا بوجھ اٹھایا ہوا ہو۔ بری ہے مثال اس قوم کی جس نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا۔ اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔''

مسلمانوں سے قبل یہود کو اللہ تعالیٰ نے حامل کتاب بنایا' بدقسمتی سے انہوں نے اس کی ذمہ داری سے اعراض کیا۔ اس آیت میں یہود کا ذکر ہمارے لیے بطور عبرت ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہود نے تورات کو اللہ کا کلام ماننے سے انکار کیا ہو' بلکہ اللہ کی کتاب کو فراموش کیا' اس میں تحریف کی' اس کی آیات بیچ ڈالیں اور اللہ کے اَحکام کو پس پشت ڈال دیا۔ یہ عملاً جھٹلانا ہے۔

اس ضمن میں ہم مسلمانوں کو بھی غور کرنا چاہیے کہ ہم قرآن کو تو مانتے ہیں لیکن کیا ہم قرآن کی مانتے ہیں؟ ایک عقیدے میں جھٹلانا ہوتا ہے اور ایک عمل میں۔ یہود نے عملاً جھٹلایا تھا لہٰذا قرآن نے انہیں گدھے سے بھی بدتر بتایا ہے۔ آج ہم مسلمان بھی قرآن حکیم کے حوالے سے تکذیبِ عملی کے مرتکب ہو رہے ہیں اور ہمارا طرزِ عمل یہود سے مختلف نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى أُمَّتِيْ مَا أَتٰى عَلٰى بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ...)) (رواہ الترمذی) ”تم پر بھی لازماً وہ حالات آئیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے تھے' بالکل اسی طرح جس طرح ایک جوتا دوسرے جوتے کے مشابہ ہوتا ہے“۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے اور ہمیں قرآن سے اپنا تعلق مضبوط کرنے اور اس کے حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آیات ۶' ۷ میں ارشاد ہوا:

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۶ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝۷﴾

”(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ اے وہ لوگو جو یہودی ہوئے' اگر تم دعویٰ کرتے ہو کہ تم اللہ کے دوست ہو دیگر لوگوں کے سوا تو آرزو کرو موت کی اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو۔ اور وہ ہرگز آرزو نہ کریں گے موت کی بسبب اُن اعمال کے جو انہوں نے آگے بھیج رکھے ہیں۔ اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے۔“

کتابِ الٰہی کے حوالے سے ذمہ داریوں سے پہلوتہی کی اصل وجہ وہ باطل خیال اور زعم ہے جو کسی نبی کی امت میں پیدا ہو جاتا ہے (ملاحظہ ہو المائدۃ: ۱۸ اور البقرۃ: ۸۰' ۱۱۱)۔ بنی اسرائیل کو زعم یہ تھا کہ ہم تو پیغمبروں کی نسل سے ہیں اور ہم بخشے بخشائے ہیں۔ ہمارا تو کوئی مسئلہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ سورۃ المائدہ میں یہود و نصاریٰ کا یہ قول مذکور ہے: ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ۭ﴾ (آیت ۱۸) ”ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اُس کے بڑے چہیتے ہیں“۔ یہ حقیقت ہے کہ جب کسی قوم یا فرد میں یہ جھوٹا خیال جم جائے تو پھر بے عملی سامنے آتی ہے۔ اور آج ہم بھی سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ کے چہیتے ہیں۔

خوار ہیں' بدکار ہیں' ڈوبے ہوئے ذلّت میں ہیں
کچھ بھی ہیں مولا ترے محبوب کی اُمّت میں ہیں!

حضور ﷺ کا امتی ہونا ایک سعادت ہے' لیکن ہمارے اعمال بھی تو درست ہوں۔ یہود کی طرح ہم باطل خیالات میں مبتلا تو نہ ہو جائیں۔ اللہ ربّ العزت کی کتاب اور نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کو فراموش تو نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ ہماری اس سے حفاظت فرمائے۔

آیت زیر مطالعہ میں فرمایا گیا کہ وہ کبھی بھی موت کی تمنا نہیں کریں گے' اس لیے کہ ان کے دلوں میں دنیوی زندگی کی محبت نقش ہو چکی ہے' جب کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ)) (رواہ مسلم) ”دنیا مؤمن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت“۔ گویا اللہ سے قربت کے لیے معیار یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص واقعی اللہ کا محبوب ہے تو دنیا میں کم سے کم جی لگائے۔ دنیا مؤمن کے لیے قید خانہ ہے اور کوئی بھی قید میں رہنا پسند نہیں کرتا' کیونکہ قید خانے میں پابندیاں ہوتی ہیں۔ مؤمن تو یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہاں کچھ عرصے کے لیے بطور امتحان بھیجا ہے اور اسے لوٹ کر واپس اللہ کی طرف جانا ہے۔ آج اُمّتِ مُسلمہ بھی اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے حُبِّ دنیا کے مرض میں مبتلا ہو چکی ہے اور موت سے انتہائی خائف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((يُوشِكُ الْأُمَمُ أَنْ تَدَاعَى عَلَيْكُمْ كَمَا تَدَاعَى الْأَكَلَةُ إِلَى قَصْعَتِهَا)) ”قریب ہے کہ دیگر قومیں تم پر ایسے ہی ٹوٹ پڑیں جیسے کھانے والے پیالوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں“۔ تو ایک کہنے والے نے کہا: کیا ہم اُس وقت تعداد میں کم ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((بَلْ أَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيرٌ، وَلَكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ، وَلَيَنْزَعَنَّ اللّٰهُ مِنْ صُدُورِ عَدُوِّكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ، وَلَيَقْذِفَنَّ اللّٰهُ فِي قُلُوبِكُمُ الْوَهْنَ)) ”نہیں' بلکہ تم اُس وقت تعداد میں بہت زیادہ ہو گے' لیکن تم سیلاب کی جھاگ کے مانند ہو گے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کے سینوں سے تمہارا خوف نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں ”وہن“ ڈال دے گا“۔ ایک کہنے والے نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ! وہن کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ)) (رواہ ابوداؤد) ”دنیا کی محبت اور موت سے کراہیت!“

موت ایک اٹل حقیقت ہے!

آیت ۸ میں ارشاد ہوا:

﴿قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۸﴾

''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ یقیناً وہ موت جس سے تم گریز کرتے ہو بیشک تم سے ملنے والی ہے' پھر تم لوٹائے جاؤ گے ظاہر اور پوشیدہ کے جاننے والے (اللہ) کی طرف تو وہ تمہیں بتلا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔''

موت ایک اٹل حقیقت ہے اور اس کا وقت متعین ہے۔ سورۃ السجدہ میں ارشاد ہوا: ﴿قُلۡ یَتَوَفّٰىکُمۡ مَّلَکُ الۡمَوۡتِ الَّذِیۡ وُکِّلَ بِکُمۡ ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمۡ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۱۱﴾﴾ ''کہہ دیجیے (اے نبی ﷺ!) تمہاری جان لے گا موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کر دیا گیا ہے' پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے''۔ موت کی جگہ بھی طے شدہ ہے۔ سورۃ النساء میں ارشاد ہوا: ﴿اَیۡنَ مَا تَکُوۡنُوۡا یُدۡرِکۡکُّمُ الۡمَوۡتُ وَلَوۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ بُرُوۡجٍ مُّشَیَّدَۃٍ ؕ﴾ (آیت ۷۸) ''تم جہاں کہیں ہو موت تمہیں آ پکڑے گی خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو''۔ موت کے وقت کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ سورۃ المنافقون میں ارشاد ہوا: ﴿وَلَنۡ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفۡسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُہَا ؕ وَاللّٰہُ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۱﴾﴾ ''اور اللہ ہرگز مہلت نہیں دیتا کسی جان کو جب اس کی موت کا وقت آ جاتا ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

اَحکامِ جمعہ اور آدابِ جمعہ

آیت ۹ میں ارشاد ہوا:

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نُوۡدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنۡ یَّوۡمِ الۡجُمُعَۃِ فَاسۡعَوۡا اِلٰی ذِکۡرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الۡبَیۡعَ ؕ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹﴾﴾

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو' جب ندا لگائی جائے جمعہ کے دن نماز کے لیے تو تیزی کے ساتھ لپکو اللہ کے ذکر کی طرف اور چھوڑ دو لین دین۔ وہ تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم اس کو سمجھو۔''

ندا سے مراد ہے اذان دینا —— آپ کے سامنے ایک ضمنی بات عرض کرتا ہوں کہ آیت کا انداز بتا رہا ہے کہ دورِ نبویؐ میں نماز کے لیے پکارے جانے کا طریقہ موجود تھا' جسے ہم اسے اذان کہتے ہیں' مگر قرآن میں کہیں اس کے الفاظ' ترتیب اور طریقہ مذکور نہیں۔ اس کی تفصیل اور طریقہ ہمیں سُنّت سے معلوم ہوا۔ تو ثابت ہوا کہ قرآن سُنّت و حدیث کی تصدیق کرتا ہے —— یہاں تاکید ہے کہ تیزی کے ساتھ جاؤ اللہ کے ذکر کی طرف' یعنی جیسے ہی جمعہ کی اذان ہو فوراً اپنے تمام کام چھوڑ دو

اور تیزی کے ساتھ لپکو اللہ کے ذکر کی طرف۔ اس سے مراد خطبۂ جمعہ ہے۔ آپ کو علم ہے کہ جمعہ کے دن خطبہ نماز سے پہلے پڑھتے ہیں۔ خطبے کا مقصد قرآن کے ذریعے لوگوں کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ' اس کے احکامات اور آخرت کی یاد دہانی کرانا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے اجتماعِ جمعہ میں حاضری کے آداب پر بھی گفتگو کر لیتے ہیں۔ ابن ماجہ میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((إِنَّ هٰذَا يَوْمُ عِيْدٍ جَعَلَهُ اللّٰهُ لِلْمُسْلِمِينَ فَمَنْ جَاءَ إِلَى الْجُمُعَةِ فَلْيَغْتَسِلْ وَإِنْ كَانَ طِيبٌ فَلْيَمَسَّ مِنْهُ وَعَلَيْكُمْ بِالسِّوَاكِ)) ''اللہ تبارک وتعالیٰ نے (جمعہ کے) اس دن کو مسلمانوں کے لیے عید کا دن قرار دیا ہے' پس جو بھی جمعہ کے لیے آئے تو وہ غسل کرے' خوشبو اگر پاس ہو تو وہ بھی لگائے اور مسواک کو بھی ضروری سمجھے''۔ مسئلے کے طور پر نوٹ کر لیجیے کہ خواتین کے لیے نمازِ جمعہ لازم نہیں ہے' لیکن کہیں باپردہ شرکت کا اہتمام ہو تو نماز ادا ہو جائے گی۔ اسی طرح مسافر' شدید بیمار اور غلام پر بھی نمازِ جمعہ کو لازم نہیں کیا گیا۔ ابوداؤد اور ابن ماجہ میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَا عَلٰى أَحَدِكُمْ إِنْ وَجَدَ أَنْ يَتَّخِذَ ثَوْبَيْنِ لِيَوْمِ الْجُمُعَةِ سِوَى ثَوْبَيْ مِهْنَتِهِ)) ''تم میں کسی پر کیا گراں ہے کہ وہ اپنے روزمرہ کے محنت کے لباس کے علاوہ دو کپڑے خرید کر جمعہ کے لیے مخصوص کر لے''۔ مہنگے کپڑے ہونا ضروری نہیں' بلکہ اچھا اور صاف ستھرا لباس ہونا ضروری ہے' جس کی یہاں تلقین کی گئی ہے۔ ابوداؤد میں روایت ہے کہ خطبۂ جمعہ میں آپ ﷺ پانچ باتوں کا اہتمام فرماتے: اللہ تعالیٰ کی حمد' رسالت کی شہادت' لوگوں کو وعظ و نصیحت' آیاتِ قرآنی کے ذریعے تذکیر اور مسلمانوں کے لیے دعا۔ کاروبار اور خرید و فروخت کو چھوڑ دینے کے حکم کی رو سے اذانِ جمعہ سے لے کر اس کے اختتام تک کاروبار اور دنیاداری کا کوئی کام کرنا حرام ہے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَا يَغْتَسِلُ رَجُلٌ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَيَتَطَهَّرُ مَا اسْتَطَاعَ مِنْ طُهْرٍ وَيَدَّهِنُ مِنْ دُهْنِهِ أَوْ يَمَسُّ مِنْ طِيبِ بَيْتِهِ ثُمَّ يَخْرُجُ فَلَا يُفَرِّقُ بَيْنَ اثْنَيْنِ ثُمَّ يُصَلِّي مَا كُتِبَ لَهُ ثُمَّ يُنْصِتُ إِذَا تَكَلَّمَ الْإِمَامُ إِلَّا غُفِرَ لَهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الْأُخْرٰى)) (رواہ البخاری) ''جو شخص جمعہ کے دن نہائے' جس قدر ممکن ہو پاکیزگی حاصل کرے' پھر تیل یا جو خوشبو گھر پر میسّر ہو لگائے' پھر گھر سے نماز کو نکلے اور دو آدمیوں کے درمیان گھس کر نہ بیٹھے (مراد یہ ہے کہ مسجد میں جا کر کسی کو تکلیف نہ دے) پھر جس قدر نماز اللہ نے

اس پر فرض کی ہے پڑھے‘ پھر امام خطبہ دے تو بالکل خاموشی کے ساتھ اس کو سنے تو اس کے وہ تمام (صغیرہ) گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں جو اُس نے ایک جمعے سے دوسرے جمعے تک کیے ہیں۔‘‘

خطبہ جمعہ کا سننا اور کثرت سے ذکر واذکار

آیت ۱۰ میں ارشاد ہوا:

﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۱۰﴾

’’پھر جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل (روزی) میں سے تلاش کرو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔‘‘

آیت زیر مطالعہ میں نمازِ جمعہ کے بعد کاروبار کی اجازت دی گئی ہے‘ البتہ اس کے ساتھ یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ نہ صرف مسجد میں بلکہ مسجد سے باہر بھی اللہ کا کثرت سے ذکر کرنا ہے۔

آیت ۱۱ میں ارشاد ہوا:

﴿وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا ۨانْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا ۭ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝۱۱﴾

’’اور جب انہوں نے دیکھی تجارت یا کھیل تماشا تو وہ اس کی طرف چلے گئے اور آپؐ کو کھڑا چھوڑ دیا۔ (اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دیجیے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے کھیل تماشے یا تجارت سے۔ اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔‘‘

دورِ نبوی میں ابتداءً عیدین کی نمازوں کی طرح جمعہ کی نماز پہلے ادا کی جاتی تھی اور خطبہ بعد میں دیا جاتا تھا۔ تو یہاں بتایا گیا کہ خطبہ جمعہ کو ضرور سننا چاہیے‘ اس لیے کہ وہ لہو ولعب اور کاروبار وتجارت سے بہت بہتر ہے۔ یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ یہاں کھیل تماشے کا ذکر تجارت سے پہلے ہے‘ اور آج ہماری اکثریت کھیل تماشا یعنی ٹی وی پروگراموں‘ کرکٹ میچ اور دیگر لغویات کی وجہ سے اجتماعِ جمعہ میں تاخیر سے آتی ہے یا بالکل ہی محروم رہ جاتی ہے‘ جو انتہائی افسوس کا مقام ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں درس میں بیان کی گئی تمام باتوں پر صحیح معنوں میں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!!

❁❁❁

رؤیتِ ہلال کا مسئلہ:

بصری یا نظری؟

اُمّتِ مُسلمہ کا ایک زندہ مسئلہ

انجینئر مختار فاروقی

ہر سال رمضان المبارک کے آغاز اور عیدین کے موقع پر نئے چاند کی تاریخ کے تعین کے سلسلے میں دن بدن نزاع بڑھتا چلا جا رہا ہے جو تمام مسلمانوں اور اتحاد بین المسلمین کے علمبرداروں کے لیے ذہنی پریشانی کا باعث بنتا ہے۔ نئے قمری ماہ کا چاند دیکھنے کا مسئلہ بظاہر تو سادہ سا ہے مگر دورِ حاضر کی حیران کن ترقی اور وسائل کی فراوانی نے اسے ایک اہم قضیہ بنا دیا ہے۔ ایک صدی پہلے تک جہاں جہاں مسلمان بستے تھے وہاں مقامی مطلع کے مطابق چاند دیکھ کر قمری مہینے کی یکم تاریخ کا تعین کر لیتے تھے۔ اس لیے کہ سفر مشکل تھے اور اطلاعات کی منتقلی زیادہ تیز رفتار نہیں تھی‘ زیادہ سے زیادہ سفر روزانہ ۱۵-۲۰ میل (یا ۲۰-۳۰ کلومیٹر) ہوتا تھا۔ اس درجے میں مطلع کا ویسے ہی زیادہ تفاوت نہیں ہوتا۔

دورِ حاضر میں ایک آدمی سعودی عرب میں چاند دیکھ کر جہاز میں بیٹھتا ہے اور رات گیارہ بجے تک کراچی پہنچ جاتا ہے یا آدمی کراچی سے عصر کے وقت روانہ ہو کر جدہ اُترتا ہے تو وہاں مغرب/عشاء کے درمیان کا وقت ہوتا ہے۔ دوستوں کو موبائل پر اطلاع دے سکتا ہے کہ چاند نظر آ گیا ہے۔ لمحے لمحے کی خبریں یہاں سے وہاں‘ مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق پہنچ رہی ہیں‘ لہٰذا اب ہماری ذہنی ساخت اور صدیوں سے بنے بنائے نسلاً بعد نسل جاری ذہنی پیمانے بھی مجروح ہو رہے ہیں۔

قرآن مجید بلاشبہ اللہ کا کلام ہے اور سُنّتِ رسول ﷺ قرآن کی تشریح اور تفاصیل کے تعین کے لیے واحد سرچشمہ ہے۔ قرآن وسنت اپنی جگہ لیکن قرآن وحدیث سے ہمارے ذہنوں

نے کچھ چیزیں اخذ کرنے کے لیے ایک کائناتی تصور کا معہودِ ذہنی ساخت اور سانچہ یا کنیڈا پہلے ہی بنا لیا ہوتا ہے‘ جو ہر دور میں اپنے دور کے مروّجہ علوم اور عصری علوم کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ چودہ سو سال پہلے کائنات سے متعلق قرآن وحدیث کے الفاظ سے جو سمجھا گیا وہ اس دور کے عصری علوم کی فضا سے باہر نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس کا مکلّف ٹھہرایا ہے‘ تاہم گزشتہ دو تین صدیوں میں مغربی علوم کی ترقی کے ساتھ کائنات کے بارے میں جو انسانی معلومات میں حد درجہ اضافہ ہوا ہے اس سے قرآن وحدیث کے الفاظ اور متن میں تو نہ کوئی فرق پڑنے والا ہے اور نہ آئندہ پڑے گا‘ مگر ہمارے ذہنی پیمانے اور تصورات کو اس ترقی سے ضرور دھچکا لگتا ہے جس صورتِ حال کو ہم جلد بازی میں ’’قرآن وحدیث کے خلاف‘‘ کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں۔ حالانکہ کائناتی حقائق کے بارے میں سائنسی ترقی قرآن مجید کے الفاظ اور متن کو زیادہ حق ثابت کر رہی ہے اور اس کی تائید اور تقویت کا باعث ہے‘ جس کا ہمیں اعتراف کرنا چاہیے۔ اس کی درج ذیل مثالیں سامنے رکھیں‘ اللہ تعالیٰ آپ کے ذہن رسا کو قرآن وسنّت کے تصوّر کے قریب تر کر دیں گے۔ (مزید انشراحِ صدر کے لیے فرانس کے نومسلم ڈاکٹر موریس بکائی کی کتاب ’’بائبل‘ قرآن اور سائنس‘‘ کا مطالعہ کریں۔)

آج سے چھ ہزار سال پہلے سے لے کر اٹھارھویں صدی تک دنیا بھر میں عوامی سطح پر زمین کے چپٹا ہونے کا تصوّر تھا۔ (آج بھی دور دراز علاقوں میں کم تعلیم یافتہ لوگ شاید اسی دور میں رہ رہے ہیں۔) آسمان کا بلند ہونا بھی بس چند سو میٹر سے زیادہ فاصلے کا تصوّر نہ تھا۔ اسی لیے ہمارے قدیم مذہبی لٹریچر میں اور قرآن کی تشریح میں جو اس دور کی تحریریں ہیں ان میں طوفانِ نوحؑ کا تذکرہ عجب انداز میں ہے کہ وہ پوری زمین پر آیا تھا‘ بلکہ دیہاتی سطح پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیڑا آسمان سے جا لگا تھا۔

قرآن مجید میں سورۃ المؤمن (آیت ۳۶‘ ۳۷) میں ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوتِ توحید دی اور ربّ العالمین کا ذکر فرمایا تو فرعون نے بزعمِ خویش اپنے وزیر ہامان کو کہا کہ میرے لیے ایک اونچی سی عمارت بناؤ تاکہ اس پر چڑھ کر دیکھوں کہ موسیٰ کا رب فضاؤں میں کہاں ہے؟ — اس کے خیال میں دس بیس منزلہ مکان کی چھت (یا اونچے سے اونچے اہرام ۴۰۰ فٹ) پر کھڑے ہو کر فضا میں اللہ کے بارے میں خبر لائی جا سکتی ہے۔ یہ کوتاہ فہمی صرف فرعون کا قصور نہیں

تھا بلکہ کئی سو سال تک طبیعیات کی دنیا کے یہی تصوّرات رہے۔ انسان وحی الٰہی کی بھی وہی تشریحات کرتا ہے جو اس کے مروّجہ علومِ عصری سے ایک ذہنی ظرف تیار ہو چکا ہوتا ہے اور یہی سلسلہ ماضی میں جاری رہا ہے۔

الحمدللہ‘ حقیقت کے عین مطابق اُمّتِ مسلمہ کا ایمان ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے‘ اس کے الفاظ اٹل اور مستقل ہیں‘ قرآن مجید کی تشریح سُنّتِ رسول ﷺ ہے اور اس سنّت کا ماخذِ اوّل کتبِ احادیث اور پھر آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ تاہم چونکہ احادیث کے الفاظ اور متن میں انسانی ذہن اور یادداشت کو دخل ہے‘ لہٰذا صحابہؓ اور تابعینؒ کے دور کے بعد کے راویان کی وجہ سے حدیث کے صحیح ہونے اور مفہوم کے ادا ہونے کے باوجود اس کے الفاظ کے غیر نبویؐ ہونے کا امکان ہے۔

اس پر مستزاد ہے عصری علوم اور طبعی اور جغرافیائی حقائق کے زیر اثر آج سے ہزار سال قبل کا ذہن جس نے علومِ انبیاء علیہم السلام کو اخذ کیا اور ان کی تشریح کی‘ لیکن اُس دور کے کائنات کے تصوّر سے بہرحال باہر نہیں جا سکتے تھے اور نہ یہ ممکن ہی تھا۔ آج گزشتہ پانچ صدیوں کی محنت اور تجرباتی علوم کی ترقی کے باعث فلکیات اور طبقاتی سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اب کائنات کا تصوّر ہی بدل گیا ہے اور پرانے ذہنی سانچے الٹ پلٹ ہو گئے ہیں۔

اسی طرح چاند‘ زمین اور سورج سے متعلق حقائق کی دریافت سے بھی پرانا ذہن بدل چکا ہے۔ اگرچہ قرآن مجید کے الفاظ اٹل ہیں اور احادیث اور سنّتِ رسول ﷺ بھی غیر متبدل ہے‘ تاہم سائنسی اور کائناتی حقائق کی دریافت اور علم کی وسعتوں کے پیش نظر انسان کا ذہنی ظرف بدلا ہے‘ تو قرآن وحدیث کے الفاظ کی روشنی میں حقائق پر دوبارہ غور وفکر کی ضرورت ہے‘ اور یہ بھی کسی اور کو نہیں‘ علماء کرام اور ماہرینِ قرآن وسُنّت ہی کو کرنا ہوگا۔

اس پس منظر میں دیکھیے‘ قمری مہینے کی ابتداء اور رؤیت ہلال کا مسئلہ اہم ہونے کے باوجود کوئی لاینحل مسئلہ نہیں ہے۔ آیئے چند بنیادی حقائق پر نظر ڈالیں اور غور کریں۔

زمانہ قدیم میں قمری اور شمسی دونوں طرح کے کیلنڈر رائج تھے اور آج بھی ہیں اور مذاہب واقوامِ عالم عام طور پر کسی ایک کو اپنے لیے اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اسلام کی آفاقیت کی دلیل اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کا مظہر ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اسلام کی تعلیمات کو بروئے کار

لانے کے لیے سورج اور چاند دونوں سے متعلق وقت کی پیمائش کو اپنا اپنا مقام دیا ہے:

(i) نمازوں کے لیے سورج کے طلوع وغروب کے حوالے سے پانچ فرض نمازوں کے اوقات (زوال‘ طلوع‘ غروب وغیرہ) سورج سے متعلق کر دیے گئے ہیں۔

(ii) فصلوں کا نظام اور عُشر کا نظام بھی سورج کے ساتھ وابستہ ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کو قمری نظام سے جوڑنا ممکن نہیں ہے اور نہ ہی جوڑا گیا ہے۔

(iii) اسلامی تقویم اور حج اور روزہ کی عبادات کو چاند کی حرکت اور تغیر وتبدّل کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے اور اس میں بڑی حکمتیں ہیں۔ ویسے تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں‘ تاہم جو حکمت عیاں ہے وہ یہ کہ روزہ اور حج کو قمری کیلنڈر سے جوڑ کر ان عبادات کو کسی ایک موسم کی بجائے سال بھر کے دوران چلایا گیا ہے کہ دنیا کے ہر خطے اور علاقے کے لوگ مختلف موسموں اور فصلوں اور مصروفیات کے دوران ان عبادات کے لیے وقت نکالیں اور سردیوں گرمیوں کے مستقل خانوں میں مقید نہ رہیں۔

(iv) نمازوں کے اوقات کے لیے پہلے سورج کو دیکھا جاتا تھا اور سائے سے اندازہ لگایا جاتا تھا‘ اب اس نے ترقی کر کے گھڑی کی شکل اختیار کر لی ہے۔ سوئیوں والی گھڑی کی بنیاد سورج اور سایہ کی تبدیلی ہی ہے۔

(v) اب موجودہ دور میں ایک قدم آگے بڑھ گیا ہے اور ڈیجیٹل کلاک نے تو سارا منظر تبدیل کر دیا ہے اور گھڑی اور سورج کا ایک موہوم سا تعلق بھی قصہ ماضی بنا دیا ہے۔

دورِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں رؤیتِ ہلال سے متعلق مختلف مواقع پر مندرجہ ذیل قسم کی صورتِ حال پیدا ہوئی۔

(i) اسلام میں عیدوں کی تہواری اہمیت اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ترغیب اور تشویق کے نتیجے میں عام شوق تھا کہ چاند دیکھا جائے۔ اگرچہ کبھی بھی شاید ایسا نہیں ہوا کہ لازماً تمام مرد وخواتین چاند دیکھیں‘ تاہم اگر اکثر نے چاند دیکھ لیا تو بات اولی الامر تک پہنچائی گئی اور چاند کا اعلان کر دیا گیا۔

(ii) مطلع کے صاف نہ ہونے یا کسی اور وجہ سے ہلال عمومی طور پر نظر نہیں آیا تو کم از کم دو معتبر

گواہ ہونے کی صورت میں اولی الامر نے چاند ہونے کا فیصلہ دے دیا۔

(iii) کسی علاقے میں چاند نظر نہیں آیا بلکہ باہر سے کوئی آدمی آیا اور اس نے (مطلع کے ذرا سے فرق کی وجہ سے) چاند دیکھنے کی شہادت دی تو اولی الامر نے چاند دیکھنے کا فیصلہ کر دیا۔

(iv) دورِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں رمضان کے تیسویں دن ایک آدمی مدینے سے باہر سے آیا اور اس نے چاند ہونے کی اطلاع دی تو رسول اللہ ﷺ نے روزہ کھلوا کر عید ہونے کا اعلان فرما دیا۔

(v) اسلامی سلطنت کی وسعت پر مختلف شہروں میں چاند کا فیصلہ ہونے کی صورت میں قریبی علاقہ جہاں تک اطلاع پہنچائی جا سکتی تھی (زیادہ سے زیادہ ایک روز کا سفر) وہاں تک نیا چاند نظر آنے کو تسلیم کر کے اس کے مطابق عمل کیا گیا۔

دورِ حاضر میں علماء کرام اور ماہرینِ قرآن و سنت نے مختلف مواقع پر نئے تناظر میں اجتہاد کیا ہے اور اُمّت کی رہنمائی کی ہے۔ یہ اجتہادی فیصلے بڑے اہم ہیں‘ اب وہاں سے آگے کی طرف مزید سوچنے کی ضرورت ہے۔ ساٹھ کی دہائی میں جب پاکستان مغربی اور مشرقی حصوں پر مشتمل تھا ایسا بھی ہوتا تھا کہ مغربی پاکستان میں چاند نظر آیا تو ایک ہزار میل دور مشرقی پاکستان میں عید کر لی گئی اور اگر مشرقی پاکستان میں چاند نظر آیا تو مغربی پاکستان میں عید کر لی گئی‘ اگرچہ مروّجہ طور پر مشرقی اور مغربی پاکستان میں ایک گھنٹے کا فرق تھا۔ اب مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد کیا ایک ہزار میل (۱۶۰۰ کلومیٹر) کے فاصلے پر دالبندین (بلوچستان) کا بحرین یا الجبیل (سعودی عرب کا مشرقی مقام) سے ہلال کی رؤیت کو نہیں جوڑا جا سکتا؟ پشاور میں چاند نظر آنے پر گوادر اور تربت میں عید ہو سکتی ہے تو تربت میں چاند نظر آنے پر پورے ملک میں عید کیوں نہیں ہو سکتی؟ امرتسر اور لاہور کا فرق پچاس کلومیٹر کا ہے۔ شاید گوادر میں رؤیت ہلال پر لاہور میں عید ہو جائے‘ مگر امرتسر میں چاند نظر آنے پر ممکن نہیں۔ کیوں؟ حالانکہ مطلع کا کوئی فرق نہیں اور مطلع اور فضا ہر قسم کی جغرافیائی حدود سے بالاتر چیز ہے۔ اسی طرح سعودی عرب اور مصر‘ سعودی عرب اور کویت‘ امارات‘ عراق‘ اردن اس طرح ہیں جس طرح پاکستان کا صوبہ بلوچستان اور صوبہ سرحد اور کشمیر۔ پھر اللہ تعالیٰ نے عالمِ اسلام کو جو جگہ دی ہے وہ جغرافیائی اعتبار سے بڑی اہم ہے۔

انڈونیشیا‘ ملائیشیا سے مراکش تک صرف چھ گھنٹے کا فرق ہے‘ جبکہ پاکستان سے لے کر سعودی عرب تک کا علاقہ اس کا وسط ہے۔ اگر اس درمیانی علاقہ میں چاند نظر آ جائے تو پورے عالمِ اسلام میں رؤیت تسلیم کی جانی چاہیے۔

اس سے بھی ذرا ہٹ کر غور فرمائیں۔ پورے فضائی ماحول میں چاند وہ واحد کُرّہ ہے جس سے متعلق انسانی معلومات آج زمین کے بعد سب سے زیادہ ہیں‘ اس لیے کہ وہاں تو مختلف مہمات کے دوران انسان کے بھیجے ہوئے مشینی آلات سمیت چاند گاڑی اتر چکی ہے۔ لہٰذا اس کی حرکات اور مدار کے لمحے لمحے کی کیفیت کا ہمیں گھر بیٹھے اندازہ ہے۔ اسی لیے ہم سب جانتے ہیں کہ اب سال پہلے (بلکہ آئندہ دس سال کے چاند سورج کے گرہنوں کا شیڈول دیا جا سکتا ہے) چاند گرہن اور سورج گرہن کے اوقات‘ دورانیہ اور تاریخ سے متعلق اطلاع دے دی جاتی ہے۔ اس وقت اور فی الواقع گرہن کے وقت میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔

گویا چاند کی محوری گردش اور سالانہ گردش کی معلومات کے پیشِ نظر سال بھر کے چاند کے سفر اور کسی خاص مطلع پر اس کے نظر آنے کی پیشگی اطلاع ہو سکتی ہے۔ جیسے سورج کے طلوع و غروب کے سائنسی نظام سے بنے چارٹوں سے ہم لوگ فائدہ حاصل کر کے روزہ رکھتے اور افطار کرتے ہیں اسی طرح اس کے مماثل چاند کے بارے میں معلومات کے تحت رمضان المبارک کے آغاز و اختتام کا فیصلہ نہ خلافِ عقل و فطرت اور نہ اَبعد مِنَ السُّنّۃ ہے۔

ایک اور نظر سے دیکھیں تو ہمارے قابلِ احترام علماءِ کرام اور ماہرینِ قرآن و سُنّت نے اس طرح کا ایک اجتہاد پہلے سے کر رکھا ہے اور اسی کا فتویٰ بھی دیا جاتا ہے اور ایسا فتویٰ حالات کا تقاضا بھی ہے اور قرآن و سُنّت کی صحیح رہنمائی بھی۔ و ھو ھذا ____ کُرّۂ ارض کے انتہائی شمالی ممالک اور علاقوں میں چھ ماہ کی رات اور چھ ماہ کا دن ہوتا ہے‘ یا کم و بیش اس طرح کے حالات ہیں۔ ایسی صورت میں صاف ظاہر ہے کہ یا تو علماء کرام یہ فتویٰ دیتے کہ وہاں کے مسلمان سال میں صرف پانچ نمازیں پڑھیں اور روزے بالکل نہ رکھیں۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ شریعت کے ظاہری منشا کے خلاف ہوتا۔ اب علماء کرام کا فتویٰ یہ ہے کہ وہاں کے مسلمان دیگر قریبی مسلمان ممالک کے مطابق گھڑی دیکھ کر ۲۴ گھنٹے میں پانچ نمازیں ادا کریں اور گھڑی دیکھ کر رمضان المبارک کے ماہ میں روزے

بھی رکھیں۔ اب دیکھیں یہ صلوٰۃ جیسی عبادت کا سارا نظام سورج کی ظاہری حرکت سے کاٹ کر نظری صورت حال سے جوڑ دیا گیا ہے‘ حالانکہ قرآن مجید میں ﴿كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ (النساء:۱۰۳) کا لفظ آیا ہے اور بصری طور پر سورج نظر آتا بھی ہے۔ چھ ماہ کے دن میں صبح کا مکروہ وقت ہمارے کئی دنوں کے برابر ہوگا‘ زوال کا وقت بھی ہمارے کئی دنوں کے برابر ہوگا‘ عصر کے بعد کا وقت بھی ہمارے تقریباً دس دنوں کے برابر ہوگا (جس میں اس دن کی عصر کے علاوہ کوئی دوسری نماز نہیں پڑھی جاسکتی) تو گویا سورج زوال پر ہے‘ نماز اور سجدہ منع ہے‘ مگر آپ کئی دفعہ ظہر‘ عصر‘ مغرب‘ عشاء‘ فجر ادا کر رہے ہیں۔ علیٰ ھٰذا القیاس طلوع اور غروب کے وقت بھی۔

اگر بصری طور پر دیکھتے ہوئے بھی سورج کے زوال اور غروب وطلوع کے ممنوعہ اوقات میں کئی فرض نماز ادا کرنے کی اجازت ہوسکتی ہے تو چاند کی نظری حرکت کے پیش نظر پاکستان کا کیلنڈر کیوں ترتیب نہیں دیا جاسکتا؟ حالانکہ یہ ایک قابلِ عمل چیز ہے۔

سورۃ البقرہ‘ رکوع ۲۳ میں جہاں روزہ کے احکام وارد ہوئے ہیں (ماہ صیام کا آغاز اور عیدالفطر کے لیے رؤیت ہلال کی سب سے زیادہ اہمیت ہے کہ فیصلہ کرنے میں وقت کم ہوتا ہے) وہاں اس رکوع سے متصلاً بعد آیت (البقرۃ:۱۸۹) ہے:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ﴾

’’(اے نبیﷺ!) لوگ آپ سے نئے چاند کے بارے میں دریافت کرتے ہیں (کہ گھٹتا بڑھتا کیوں ہے!) کہہ دو کہ وہ لوگوں کے لیے اوقات (کے تعین) اور حج کے موسم کے لیے ہے۔‘‘

یعنی چاند کا فی نفسہٖ کوئی قابلِ احترام شے ہونا غلط فہمی ہے۔ یہ تو لوگوں کے لیے وقت کی پیمائش کا ایک ذریعہ ہے اور حج (کے معلوم کرنے) کا بھی۔ تو جیسے سال بھر کے لیے طلوع وغروب کے چارٹ مطبوعہ ملتے ہیں اسی طرح چاند سے متعلق سال بھر کا کیلنڈر بن جانا بھی کوئی خلافِ عقل و فطرت بات نہیں ہے۔ (واللہ اعلم!)

انہی علاقوں میں جہاں دن اور رات کی طوالت غیر معمولی ہوتی ہے‘ چاند کی رؤیتِ بصری کا معاملہ بھی زیادہ پریشان کن ہے۔ جہاں سورج چھ ماہ نظر آتا ہے وہاں چاند نظر نہیں آسکتا‘ لہٰذا ان

چھ ماہ کے دوران روزہ‘ حج اور قمری مہینہ کی تاریخ کے لیے آپ کو ہزار میل دور کے کسی غیر ملک کی قمری تقویم (نظری تقویم) پر عمل کرنا ہوگا۔

اسی بات کو ایک مختلف زاویہ نگاہ سے ملاحظہ فرمائیں۔ دن کئی ماہ کا ہوجائے یا رات‘ چاند نظر آئے یا نہ آئے‘ درحقیقت بات عام حالات میں معمول کی زمینی گردش میں اپنے محور کے گرد ایک چکر مکمل کرنے کی ہے جس کو عام معروف معنیٰ میں ایک دن (one day) یا دن رات یا ۲۴ گھنٹے کہا جاتا ہے۔

صحیح مسلم‘ کتاب الفتن میں ایک حدیث میں حضرت نواس بن سمعان ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دجال کا تذکرہ فرمایا:

قُلْنَا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَمَا لُبْثُهٗ فِي الْاَرْضِ؟ قَالَ: ((اَرْبَعُوْنَ يَوْمًا يَوْمٌ كَسَنَةٍ وَيَوْمٌ كَشَهْرٍ وَيَوْمٌ كَجُمُعَةٍ وَسَائِرُ اَيَّامِهٖ كَاَيَّامِكُمْ)) قُلْنَا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَسَنَةٍ اَتَكْفِيْنَا فِيْهِ صَلَاةُ يَوْمٍ؟ قَالَ: ((لَا! اُقْدُرُوْا لَهٗ قَدْرَهٗ))

’’ہم نے دریافت کیا: یارسول اللہ! وہ زمین پر کتنی مدت رہے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’چالیس دن تک‘ ایک دن ان میں اک سال کے برابر ہوگا‘ اور دوسرا ایک مہینے کے‘ اور تیسرا ایک ہفتہ کے‘ اور باقی دن جیسے یہ تمہارے دن ہیں۔‘‘ (تو ہمارے دنوں کے حساب سے دجال ایک برس دو مہینے چودہ دن تک رہے گا)۔ اصحابؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جو دن سال بھر کے برابر ہوگا اس دن ہم کو ایک ہی دن کی نماز کفایت کرے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’نہیں! تم اندازہ کر لینا اس دن میں بقدر اس کے (یعنی جتنی دیر کے بعد اِن دنوں میں نماز پڑھتے ہو اسی طرح اُس دن بھی اندازہ کر کے پڑھ لینا)۔‘‘

اندازے سے نمازیں ادا کرنا (اور روزے رکھنا) گویا حدیث صحیح سے ثابت ہوگیا (اور غالباً یہی بنیاد ہے علماء کے اوپر تذکرہ شدہ فتویٰ کی) اگرچہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ خاص حالات کی بات ہے اور اس خاص کو عام کیسے کیا جاسکتا ہے؟ غور طلب بات یہی ہے کہ اگر معروضی دنیا میں حالات سابقہ ڈگر پر چلتے رہتے اور طبیعیات اور فلکیات میں تحقیق کا معیار وہی صدیوں پرانا انسانی آنکھ کا مشاہدہ ہی ہوتا تو بلاشبہ یہی فتویٰ رہتا جو قرونِ اولیٰ میں رہا اور صدیوں بعد تک قابلِ عمل

رہا۔ مگر حالات‘ معیارِ تحقیق اور وسائل تحقیق نے ترقی کر لی ہے اور اب مشاہدہ کی بنیاد ہے تو انسانی آنکھ کا مشاہدہ‘ تاہم دوربین اور خوردبین اور دیگر ذرائع مواصلات مثلاً وائرلیس‘ ایکسریز‘ موبائل فونز اور سیٹلائٹس وغیرہ سے اب انسان عام مشاہدہ کی باریک چیز کو ایک لاکھ گنا بڑا کر کے دیکھ سکتا ہے اور کروڑوں نوری سال دور کے کسی سیارے کو قریب کر کے انسانی آنکھ کے لیے قابل مشاہدہ بنا سکتا ہے۔ لہٰذا چاند‘ سورج اور دیگر اجرامِ فلکی کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ اب پہلے سے کہیں زیادہ گہرائی میں اور صحت اور تعین کے ساتھ کیا جا سکتا ہے‘ صرف ظن و تخمین نہیں۔

حضرات علماء کرام اور ماہرینِ قرآن و حدیث کے لیے یہ بات بڑی قابل لحاظ ہے کہ ذرائع تحقیق میں اضافہ‘ علمی مواد کی فراوانی اور کل جہان میں بیک وقت اپنے مطالعہ کی میز پر دستیابی (انٹرنیٹ کے ذریعے) اور وسائل آمد و رفت اور اطلاعات کے طوفان نما انقلاب نے ایسے حالات پیدا کر دیے ہیں کہ مسلمانانِ عالم کو ایک بین الاقوامی اُمت کی طرف پیش رفت کے لیے فکری بنیادیں فراہم کرنا گردو پیش کی ضرورت ہے۔

آج دنیا کو ایک عالمی گاؤں (Global Village) کہا جا رہا ہے اور ملکوں کی حیثیت ایک لحاظ سے گاؤں کے مکانوں سے بھی زیادہ قریب کی ہوتی جا رہی ہے۔ دو چار کلومیٹر قریب کا واقعہ گھنٹہ دو گھنٹہ بعد عالمی نشریاتی اداروں سے چہار دانگ عالم میں پھیل جاتا ہے۔ اگرچہ دنیا نے یہ ترقی کر کے انسانی وحدت اور ایک عالمی حکومت کا جواز پیدا کر دیا ہے‘ مغربی اقوام اور ایک اَن دیکھی قوت اس کو اپنے حق میں استعمال کرنے پر گویا تلی ہوئی ہے‘ لیکن دراصل اس سارے انتظام سے حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت (قرآن مجید) کی تعلیمات کی ابدیت اور آفاقیت کے اظہار کا موقع میسّر آ رہا ہے اور تاریخ کا بہاؤ اور سائنسی ترقی انسانیت کو پیغمبر انقلاب اور محسن انسانیت ﷺ کے لائے ہوئے نظام کے عالمی غلبے کی طرف ہانک رہی ہے۔ اور یہ عفت و عصمت کے روحانی نظام کی طرف لے جانے کا ایک فطری اور عقلی دباؤ ہے جس کے تحت انسان اسی منزل کی جانب پیش قدمی کرنے پر مجبور ہے جسے شعر کی زبان دی ہے ڈاکٹر علامہ اقبال نے ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو
زانکہ از خاکش بروید آرزو

یا ز نورِ مصطفیٰؐ او را بہا ست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

یا جیسے ربّ ذوالجلال نے خود قرآن مجید میں ایک خبریہ انداز میں فرمایا:

﴿سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿٥٣﴾﴾ (حٰمٓ السجدہ)

’’ہم عنقریب ان کو اطرافِ عالم میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے۔ کیا تم کو یہ کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار ہر چیز سے خبردار ہے!‘‘

گویا ایک عالمی اسلامی عوامی (جمہوری) فلاحی ریاست کا انسانی خواب اب پورا ہو کر رہے گا جو اعلیٰ انسانی اقدار کو سیاسی اور معاشی سطح پر سمو کر مشرق و مغرب کے تمام انسانوں کو اپنے اندر سمیٹ لے گی۔ ان شاء اللہ! جہاں تمام نوعِ انسانی بلالحاظِ رنگ و نسل و مذہب سکھ کا سانس بھی لے گی اور جہاں عدل و انصاف اور شرفِ انسانی کے اعلیٰ اخلاقی و روحانی اقدار کا فروغ بھی ہوگا۔ اور یہ سب نعمتیں ہر انسان کو گھر کی دہلیز پر میسّر آئیں گی۔ یقیناً مبارکباد کے لائق ہیں وہ لوگ جو اس اعلیٰ نصب العین کے لیے کوشاں ہیں اور اس کو آج کے ذہنوں میں اتارنے کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ اور یقیناً ایسے لوگوں کا وجود بھی بڑا مبارک ہے جو اس راستے کے کانٹے ہی دور کرنے پر اپنا وقت لگا رہے ہیں اور آنے والوں کے لیے آسانیاں پیدا کر رہے ہیں۔ درحقیقت حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی رحمۃٌ للعالمینی کی شان دراصل اسی وقت ظاہر ہوگی کہ واقعی ان کا لایا ہوا دین تمام نوعِ انسانی کے لیے کتنے فائدہ اور برکت کا حامل تھا اور ہے۔ جو لوگ آج اس آنے والی تبدیلی کے راستے میں مشکلات پیدا کر رہے ہیں کل وہ بھی اس کی حقانیت کے نہ صرف قائل ہو جائیں گے بلکہ اسی کے گُن گا رہے ہوں گے۔ چنانچہ ایک حدیث میں لسانِ رسالت‘ لسانِ حق ترجمان علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یوں الفاظ ادا ہوئے ہیں:

((لَا يَبْقٰى عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيْزٍ اَوْ ذُلِّ ذَلِيْلٍ، اِمَّا يُعِزُّهُمُ اللّٰهُ فَيَجْعَلُهُمْ مِنْ اَهْلِهَا اَوْ يُذِلُّهُمْ فَيَدِيْنُوْنَ لَهَا)) قُلْتُ: فَيَكُوْنُ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (مسند احمد‘ عن المقداد)

’’روئے زمین پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر رہ جائے گا اور نہ اونٹ کے بالوں کا بنا

ہوا خیمہ‘ جس میں اللہ کلمۂ اسلام کو داخل نہ کر دے‘ خواہ کسی سعادت مند کو عزت دے کر اور خواہ کسی بدبخت کی مغلوبیت کے ذریعے‘ یعنی یا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ لوگوں کو (اسلام کی بدولت) عزت عطا فرما دے گا اور انہیں کلمۂ اسلام کا قائل وحامل بنا دے گا۔ یا (حالت کفر پر برقرار رہنے کی صورت میں) انہیں مغلوب فرما دے گا کہ وہ اس کے محکوم اور تابع بن کر رہیں گے۔ (حضرت مقداد ؓ فرماتے ہیں کہ اس پر) میں نے (اپنے دل میں) کہا: ''پھر تو واقعتاً دین کل کا کل اللہ ہی کے لیے ہو جائے گا۔''

اس آنے والے دور ہی کے لیے ایک بنیادی کڑی اور سفری بیگ وغیرہ کو کھولنے والی zip کی پہلی کڑی کی طرح کا کوئی چھوٹا سا اجتماعی عمل ہوگا جس سے عالمِ اسلام کے اجتماعی شعور میں ایک خوشگوار اتحاد اور یگانگت کی لہر دوڑ جائے گی اور بعد ازاں پے در پے واقعات اس منزل کی طرف بڑے بڑے اقدامات کا سبب بن کر بالآخر ساری محنت نتیجہ خیز ہو جائے گی۔

(یہ بات قارئین کے لیے دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ سائنسی انکشافات نے بات یہاں تک پہنچا دی ہے اور دو تین سال قبل ہمارے ہاں بھی پریس میں آ چکی ہے کہ مریخ اور زمین کچھ عرصہ بعد اتنے قریب آ جائیں گے کہ ان کا اپنا اپنا کششِ ثقل کا نظام ایک دوسرے سے متاثر ہو جائے گا‘ اور مریخ چونکہ زمین سے کئی گنا (۱۰۰ گنا) بڑا ہے‘ لہٰذا زمین کی محوری حرکت کم ہو کر ختم ہو جائے گی‘ پھر زمین کی محوری حرکت اُلٹی ہو جائے گی۔ اور زمین جب مریخ کے اثر سے آزاد ہوگی تو الٹی حرکت دوبارہ کم ہو کر ختم ہوگی اور پھر دوبارہ زمین کی صحیح سابقہ محوری حرکت کا آغاز ہوگا۔ اس طرح کا واقعاتی قران تقریباً تیس ہزار سال بعد ہو سکتا ہے‘ لہٰذا اس طرح کا گزشتہ قران معروف تاریخِ انسانی سے قبل کا ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم! زمین کی اس اُلٹی محوری گردش میں سورج مغرب سے طلوع ہوتا نظر آئے گا۔ یعنی اس واقعہ میں قربِ قیامت کی نشانی سورج کا مغرب سے طلوع ہونا بھی گویا شامل ہوگا۔)

آخری بات یہ ہے کہ رؤیتِ بصری کے بجائے رؤیتِ نظری کا اہتمام اب دورِ حاضر میں جدید فنی ایجادات اور information technology کی ترقی کی وجہ سے ضرورت ہی نہیں اُمتِ مُسلمہ کے مصالح کے تحت لازم ہے‘ اور پہلے پاکستان کے لیے ایک رؤیت نظری پر مشتمل کیلنڈر تیار کیا جانا ضروری ہے جس میں اہل علم‘ ماہرین ہیئت وجغرافیہ اور ماہرینِ قرآن وسنت

شامل ہوں۔ اسلامی نظریاتی کونسل یا شریعت کونسل یا کوئی دیگر خصوصی نو تشکیل شدہ ادارہ کے تحت یہ کام کیا جا سکتا ہے اور یوں قرآن اور حدیث کے مسلّمات پر ڈٹے رہنے کے ساتھ ساتھ فرائض کی ادائیگی اور اسلامی تہواروں کے تعین کے لیے عالمی امت اور امت واحدہ کا تصور اُجاگر کیا جا سکتا ہے۔

اس مقصد کے لیے آپ غور کیجیے‘ ایک اہتمام خالقِ کائنات نے پہلے سے ہی کر رکھا ہے۔ قرآن مجید اللہ ﷻ کا کلام ہے اور اگرچہ یہ چودہ صدیاں پہلے نازل ہوا تاہم یہ کلام تا قیامت انسانوں کے لیے ہدایت کا سرچشمہ رہے گا۔ اس کے الفاظ میں چودہ صدیاں قبل کے انسانوں کے لیے بھی رہنمائی تھی اور اب بھی ہے اور آئندہ تا قیامِ قیامت رہے گی۔ اس قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے اور متکلّم کی طرح زندہ و پائندہ ہونے کی وجہ سے اس کے الفاظ میں وہ معنوی گنجائش موجود ہے جو تمسّک بالقرآن کے ٹھیٹھ تصوّر کو مجروح کیے بغیر بھی آج کے مسائل کو حل کر سکتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ ؒ کے نام سے کون واقف نہیں۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر میں فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کی تفسیر کے ضمن میں یہ اصول پیش نظر رہنا چاہیے: اَلْاِعْتِبَارُ لِعُمُوْمِ اللَّفْظِ لَا لِخُصُوْصِ السَّبَبِ'' قرآن مجید کے الفاظ کے عموم کا خیال رکھا جانا چاہیے نہ کہ سبب کے اختصاص کا۔''

الفاظ کے عمومی معنی کا خیال رکھیں گے تو اسلام میں حرکت (dynamism) اور اجتہاد کا فطری اور لابدی تصور اُجاگر ہوگا‘ جبکہ الفاظ کو کسی خاص پس منظر والے معنی میں مقید کر دیں گے تو جامدیت اور تحجر کا تصور ابھرے گا اور اسلام کے دینِ فطرت‘ آفاقی دین اور ہر دور اور ہر علاقے اور پوری انسانیت کے دین کے تصور کو اجاگر کرنے میں مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

اسی طرح حدیث کے الفاظ میں اگر متن کے الفاظ میں کوئی معنی ایسے نکلتے ہوں جو پہلے قابلِ عمل نہیں تھے‘ اب لائقِ اعتناء اور مصالح امت کے لیے ضروری ہیں‘ تو کئی دوسرے مواقع کی طرح رؤیت ہلال کے مسئلے پر اس کا اطلاق وقت کا تقاضا ہے۔

لفظ رؤیت —— عربی لغت میں دو معنی میں آیا ہے: دیکھنا اور غور کرنا‘ جیسے بصر اور بصیرت‘ ظاہری آنکھ سے دیکھنا اور دل کی آنکھ سے دیکھنا۔ اسی لیے قرآن مجید کی آیات میں مختلف جگہ مفسرین کرام نے رؤیت کے لفظ کے اپنے ذوق کے مطابق تراجم کیے ہیں۔

☆ مثال کے طور پر سورۃ الفیل میں اصحاب فیل کا واقعہ ہے اور نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ ①﴾

''کیا آپ نے نہیں دیکھا کیسا کیا تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ؟''

یہاں لفظ ''لَمۡ تَرَ'' رؤیت سے اور ''رأی'' مادہ سے آیا ہے' مگر صاف ظاہر ہے یہاں مراد رؤیت بصری ہو ہی نہیں سکتی۔ یہاں سوچنا' غور کرنا اور دل کی آنکھ سے دیکھنا ہی مراد ہو سکتے ہیں۔

☆ ایک اور مثال قرآن مجید میں فرعون کے تذکرہ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَفِرۡعَوۡنَ ذِی الۡاَوۡتَادِ ⑩﴾ (الفجر) ''اور فرعون' اوتاد' والا۔''

''وتد'' عربی میں بڑی میخ یا peg کو کہتے ہیں' قرآن مجید میں پہاڑوں کو بھی ''وتد'' کہا گیا ہے: ﴿وَّالۡجِبَالَ اَوۡتَادًا ⑦﴾ (النبا) ''اور پہاڑوں کو اوتاد بنایا۔''

ہمارے متقدمین مفسرین کرام نے ''فرعون میخوں والا'' ترجمہ کیا ہے' اگرچہ ''فرعون پہاڑوں والے'' ترجمہ کرتے تو ممکن تھا' مگر اس کی تطبیق کہ پہاڑوں سے مراد کیا ہے ایک لاینحل مسئلہ ہوتا۔ اب جبکہ عصر حاضر میں فرعون بادشاہوں کے تعمیر کردہ ''اہرامِ مصر'' دریافت ہو چکے ہیں جو پہاڑوں ہی کی طرح بڑے بڑے ہیں اور ۱۹۰۲ء میں انہی اہراموں میں سے فرعونِ موسیٰ ؑ کی لاش بھی برآمد ہو چکی ہے جو قاہرہ کے عجائب گھر میں موجود ہے۔

غور فرمائیں! قرآن مجید پہاڑوں کو ''اوتاد'' کہتا ہے اور فرعون کو ''ذی الاوتاد'' کہتا ہے تو دو باتوں کو ملانے سے منطقی نتیجہ ہے ''فرعون پہاڑوں والے'' یعنی وہ فراعنہ مصر جنہوں نے پہاڑوں جیسے اہرام اور مقبرے بنا دیے تھے۔ آج یہ ترجمہ ممکن ہے کہ علوم عصری میں یہ بات واضح ہو چکی ہے اور زبان زد خاص وعام ہے۔ اگرچہ ۱۹۰۲ء سے قبل وہی ترجمہ ممکن تھا جو ہوا۔ یہ ہمارے علومِ عصری کی نارسائی تھی' ورنہ قرآن مجید کے الفاظ میں' ربّ العالمین کے کلام میں تو یہی حقیقت جھلک رہی تھی جو آج عیاں ہو کر سامنے آ گئی ہے۔ کلامِ الٰہی میں بڑی بڑی حقیقتوں کا سادہ اور چودہ صدیاں قبل مروّجہ الفاظ میں بیان اسی ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ کے شایانِ شان ہے' کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔

اسی لفظ ''رأی'' پر غور فرمائیے۔ اس میں یہ گنجائش فاطرِ فطرت اور خالقِ ارض وسماء نے رکھی

ہے کہ رؤیتِ بصری اور رؤیتِ نظری کے معنی لیے جا سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء کرام اور ماہرینِ قرآن وسنت اس پر غور فرمائیں۔ ہمارا کام تو جرأت کر کے توجہ دلا دینا ہے' فیصلہ تو اہلِ علم ہی کر سکتے ہیں کہ پاکستان بھر کے لیے (یا ہر مسلم ملک کے لیے) ایک کیلنڈر رؤیتِ نظری کی بنیاد پر ترتیب دیا جائے۔ اگر یہ مرحلہ بآسانی طے ہو جائے تو خود علماء کرام محسوس فرمائیں گے کہ بنگلہ دیش سے لے کر سعودی عرب کے ممالک تک تقریباً ایک ہی کیلنڈر سامنے آئے گا اور پوری دنیا کی سطح پر اُمّت میں اتحاد ویگانگت کی راہ نکل آئے گی۔ اور کیا عجب کہ یہی اتحاد ویک رنگی اُمّت مرحومہ کے لیے مستقبل میں سیاسی' معاشی' معاشرتی' ذہنی اور فکری ہم آہنگی کی صورت اختیار کر لے اور یوں ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

کا دیرینہ خواب پورا ہو سکے۔ اور —— یہ خواب یقیناً حقیقت بن کر رہے گا۔ یہی مقصودِ فطرت اور منشائے ربانی ہے۔

؎ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

؎ شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!

ان دنوں کراچی میں رؤیتِ ہلال کے بارے میں سائنسی انداز میں کام ہو رہا ہے۔ لہٰذا اگر تجرباتی طور پر سال بھر کا قمری کیلنڈر جاری کر دیا جائے اور اہلِ بصیرت اور اہلِ نظر اس پر گہری نگاہ رکھیں اور عملی طور پر رؤیت ہلال کے ساتھ ملا کر دیکھتے رہیں تو میری ناقص رائے میں تین چار سال کے اندر بہت سارے عملی مسائل کی نشاندہی ہو جائے گی اور باہمی مشاورت اور غور وفکر سے ان کوتاہیوں کو دور کر کے ایک قابلِ عمل قمری کیلنڈر جاری ہو سکتا ہے۔ ایسا ہی اگر ہمارے پڑوسی ممالک میں ہو جائے تو جلد یا بدیر یہ ہمارے لیے فکری اتحاد کی بنیاد بن سکتا ہے۔

۞۞۞

مسلم معاشروں میں لڑکیوں کی بغاوت؟

اسباب و علاج [۳]

ابوکلیم مقصود الحسن فیضی

حفاظتی اقدامات

قرآن حکیم میں بڑے دوٹوک انداز میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً ؕ وَسَآءَ سَبِیْلًا ﴿۳۲﴾﴾ (بنی اسرائیل)

''اور زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو' یقیناً وہ بڑی بے حیائی ہے اور بہت ہی گھناؤنا راستہ ہے۔''

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کے معاشرتی اور سماجی نظام میں اس سماجی برائی (Social evil) کو ختم کرنے کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کی گئی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بہت دور دور تک قدغنیں لگائی گئی ہیں تاکہ کوئی اس فحش کام کے قریب تک نہ پھٹک سکے۔ اس لیے کہ ایک مسلمان سماج اور معاشرے میں عصمت و عفت اور پاک دامنی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ اس بدکاری کے جو بھی محرکات' اسباب اور داعیات ہو سکتے ہیں' اسلام ان سب پر بندشیں اور قدغنیں عائد کرتا ہے۔ اس ضمن میں ''تعمیری اقدامات'' کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں۔ اب ہم جائزہ لیتے ہیں کہ اسلامی معاشرے میں عصمت و عفت اور آبرو کی حفاظت کے اہتمام اور زنا کے سدِ باب کے لیے اسلام کیا حفاظتی اقدامات کرتا ہے۔

(۱) فواحش و منکرات کی اشاعت پر پابندی

کسی بھی معاشرہ میں اخلاقی برائیوں کے عام ہونے کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ اس معاشرہ میں زنا اور اس کے متعلقہ مواد اور خبروں کو عام کیا جاتا ہے۔ شہر کے کسی گوشہ میں اگر کوئی برا کام ہو رہا ہو تو معاشرے میں اس خبر کو عام کیا جائے اور بیمار دل والے لوگوں کو اس کی اطلاع دی جائے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں اس چیز کو 'اشاعتِ فاحشہ' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

انسان کی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ جب بھی وہ کوئی ایسی خبر سنتا ہے جو اُس کی خواہش کے موافق ہوتی ہے تو جائے خبر تک پہنچنے اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے دیکھا گیا ہے کہ اگر کوئی عورت ارتکابِ فاحشہ میں مشہور ہوتی ہے تو ہر بیمار دل انسان اس کی طرف مائل ہوتا ہے اور اس کی گلی تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے اشاعتِ فاحشہ پر سخت تنبیہ کی ہے اور اس کے مرتکب کو دردناک عذاب سے ڈرایا ہے' چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۙ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ ؕ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾﴾ (النّور)

''جو لوگ مسلمانوں میں برائی پھیلانے کے آرزومند رہتے ہیں ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے' اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے اور تم کچھ بھی نہیں جانتے۔''

صرف اسی ایک آیت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایسی خبریں یا مواد جن میں فحاشی و بے حیائی کی عام دعوت ہو' اسے لوگوں میں عام کرنا شریعت کی نظر میں کتنا بڑا جرم ہے کہ ایسا کرنے والوں کو دنیا و آخرت دونوں جگہ دردناک عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔

اس امر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

((یَا مَعْشَرَ مَنْ آمَنَ بِلِسَانِہٖ وَلَمْ یَدْخُلِ الْإِیْمَانُ فِيْ قَلْبِہٖ ' لَا تَغْتَابُوا الْمُسْلِمِیْنَ وَلَا تَتَّبِعُوْا عَوْرَاتِھِمْ' فَإِنَّہٗ مَنْ یَتَّبِعْ عَوْرَاتِھِمْ یَتَّبِعِ اللّٰہُ عَوْرَتَہٗ ' وَمَنْ یَتَّبِعِ اللّٰہُ عَوْرَتَہٗ یَفْضَحْہُ فِيْ بَیْتِہٖ))[۲۹]

''اے وہ لوگو! جنہوں نے زبان سے ایمان لانے کا اقرار تو کیا ہے لیکن ابھی تک ایمان

ان کے دل میں داخل نہیں ہوا ہے' سنو! مسلمانوں کی غیبت نہ کیا کرو اور نہ ہی ان کے عیوب کو تلاش کرو' کیونکہ جو شخص مسلمانوں کے عیوب کو تلاش کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کے عیب تلاش کرنے لگے گا' اور جس کے عیب اللہ تعالیٰ نے تلاش کیے' اسے اس کے گھر میں رسوا کر کے رکھ دے گا۔''

مقصد یہ ہے کہ جب کسی مسلمان کا عیب حق یا ناحق لوگوں کے سامنے بیان ہوگا تو اوّلاً یہ غیبت ہے جو کہ بہت بڑا گناہ ہے' ثانیاً ایک مسلمان کی عزت پامال ہوگی' ثالثاً مریض دل اور کمزور ایمان لوگ ان برائیوں کی طرف مائل ہوں گے۔ اس طرح برائی کی نشر و اشاعت ہوگی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: ''فحش گفتگو کرنے والا اور اسے لوگوں میں پھیلانے والا دونوں گناہ میں برابر کے شریک ہیں''۔(۳۰) حضرت عطاءؒ کا قول ہے: ''جو شخص زنا سے متعلقہ باتیں لوگوں میں عام کرے اسے سزا دینی چاہیے''۔(۳۱) حضرت شبیلؒ بن عوف کہتے ہیں کہ جو شخص فحش باتوں کو عام کرے وہ اسی طرح کا گناہ گار ہے جس طرح کہ اس کا علی الاعلان ارتکاب کرنے والا گناہ گار ہے۔(۳۲)

ان نصوص سے واضح ہوتا ہے کہ زنا اور اس سے متعلقہ باتوں کی اشاعت کے متعلق اسلام کی تعلیمات کیا ہیں' اور اسلام نے اس پر کس سختی کے ساتھ نکیر کی ہے' کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ جب زنا یا اس سے متعلقہ گفتگو سنتا ہے تو اس کے جنسی جذبات جوش میں آتے ہیں' اور جب کسی فاحشہ عورت یا کسی برائی کے اڈے کے بارے میں خبر پاتا ہے تو فطری طور پر بتقاضائے شہوت اس کی طرف مائل بھی ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ہر اُس عمل کو ناجائز و حرام قرار دیا ہے جو برائی پھیلانے کا سبب بنتا ہے' جیسے شراب' موسیقی' اور بے پردگی وغیرہ' اور یہی وجہ ہے کہ قرآن نے مسلمان عورتوں کو غیر مسلم اور جن عورتوں کے کردار کا علم نہ ہو ایسی عورتوں سے بھی اپنی زینت چھپانے کا حکم دیا ہے(۳۳) اور اسی وجہ سے اللہ کے رسول ﷺ نے ہیجڑوں کو گھروں سے نکال دینے کا حکم دیا ہے' چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک بار اللہ کے رسول ﷺ حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر موجود تھے کہ آپ ﷺ نے ایک ہیجڑے کو کہتے ہوئے سنا جو حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے بھائی سے کہہ رہا تھا کہ اگر طائف فتح ہوا تو میں تمہیں غیلان کی بیٹی دکھلاؤں گا' جسے آتے دیکھو تو اس میں چار بل

پڑتے ہیں اور پیچھے سے دیکھو تو آٹھ بل پڑتے ہیں۔ جب آپ ﷺ نے اس کی یہ گفتگو سنی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((لَا يَدْخُلْ هٰذَا عَلَيْكُمْ))(۳۴) ''آج کے بعد یہ تمہارے پاس نہ آنے پائے''۔ یعنی یہ شخص چونکہ نامرد ہونے کے باوجود عورتوں کے معاملے میں دلچسپی رکھتا ہے اور عورتوں کے پردے کی بات مَردوں کو بتلاتا ہے لہٰذا یہ اشاعتِ فتنہ کا سبب بن رہا ہے' اس لیے اس سے پردہ کرو اور اپنے پاس آنے سے روکو۔

ایسی اسلامی تعلیمات کے باوجود آج ہمارے معاشرہ میں بے حیائی و بدکاری کو رواج دینے کا کام بالکل عروج پر ہے۔ متعدد ادارے اس میدان میں منظم طور پر کام کر رہے ہیں اور حکومت کی نگرانی میں کام کر رہے ہیں' بلکہ حکومت کے تعاون و سرپرستی سے کر رہے ہیں۔ ہمارے ماحول میں جو ادارے اشاعتِ فاحشہ کا کردار ادا کر رہے ہیں' ان میں سے بعض یہ ہیں:

۱) ریڈیو اور ٹی وی کا ادارہ' بدقسمتی سے یہ دونوں ادارے صرف فحش خبریں ہی نہیں بلکہ فحاشی کے عملی مظاہر بھی پیش کر رہے ہیں۔

۲) کلب' تھیٹر' سینما ہال اور اس طرح کے دیگر جائے رقص و سرود۔

۳) روزنامہ اخبارات' ہفتہ وار اور ماہانہ میگزین (بالخصوص فلمی رسالے اور فنی دنیا سے متعلقہ رسالے)۔

اب تو صورتِ حال یہ ہے کہ ایک غیرت مند باپ کوئی اخبار یا ہفتہ وار یا ماہوار پرچہ خریدتے ہوئے اس بارے میں بار بار سوچتا ہے کہ اسے اپنے گھر میں کس طرح داخل کرے؟

۴) کمرشل اشتہارات خاص طور پر عورتوں کے خصوصی استعمال کی چیزوں کے اشتہارات۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ بسا اوقات کسی فلم میں وہ عریانیت اور عاشقانہ منظر نہیں ہوتا جیسا منظر کمرشل اشتہارات میں پیش کیا جاتا ہے۔ (حیرت کی بات ہے کہ بلیڈ کا اشتہار بھی عورت پیش کرتی ہے۔)

۵) فلمیں' ڈرامے اور سیریل جو آج گھر گھر تک پہنچ چکے ہیں۔

ذرا سوچیں کہ جب فلموں میں ایسے گانے پیش کیے جائیں گے کہ ''جب پیار کیا تو ڈرنا کیا!'' تو لڑکیاں اور لڑکے اگر اپنے والدین سے بغاوت نہیں کریں گے تو پھر ان سے

اور کس چیز کی امید کی جاسکتی ہے؟

۶) مخلوط تعلیم اور غیر شرعی نصابِ تعلیم وغیرہ بھی ہمارے معاشرہ میں اشاعتِ فاحشہ کا کردار ادا کررہے ہیں۔

قارئینِ کرام! ضرورت اس بات کی ہے کہ معاشرہ کے دانشور، غیور حضرات اس نکتہ پر غور کریں اور ایک پُرامن اور پاک معاشرہ کی خاطر فواحش ومنکرات کے رواج دینے والے اداروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں، ورنہ بقول ایک غیر مسلم دانشور کے کچھ بعید نہیں کہ ہمارا ملک مکمل طور پر جنسی بے راہ روی اور زنا بالجبر کے لیے ایک تجربہ گاہ بن جائے گا۔

(۲) مرد وعورت کے آزادانہ میل جول پر پابندی

خود مرد وزن کا آزادانہ میل جول ہی فواحش ورذائل کے انتشار اور لڑکیوں کی بغاوت کا ایک بڑا اور اہم سبب ہے، اس لیے شریعت نے مرد وعورت کے اختلاط کو حرام اور ناجائز قرار دیا ہے۔ اختلاط کا معنیٰ یہ ہے کہ غیر محرم مرد وعورت کا باہم کسی ایسی جگہ جمع ہونا جہاں سے ایک دوسرے کو دیکھنا، آپس میں گفتگو کرنا اور چھونا ممکن ہو۔

سنن ابی داؤد وغیرہ میں حضرت ابو اُسید انصاری ؓ سے مروی ہے کہ ایک بار اللہ کے رسول ﷺ مسجد سے باہر نکلے تو دیکھا کہ راستے میں مرد وعورت اکٹھے چل رہے ہیں، یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے عورتوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

((اِسْتَأْخِرْنَ، فَإِنَّهُ لَيْسَ لَكُنَّ أَنْ تَحْقُقْنَ الطَّرِيْقَ، عَلَيْكُنَّ بِحَافَاتِ الطَّرِيْقِ))(۳۵)

''کنارے پر ہو جاؤ، کیونکہ تمہارے لیے راستے کے وسط میں چلنا روا نہیں ہے، تمہارے لیے راستے کے کنارے کنارے چلنا ضروری ہے۔''

راوی کہتے ہیں کہ یہ سن لینے کے بعد عورتیں بالکل کنارے ہو کر دیوار سے چمٹ کر اس طرح چلتی تھیں کہ بسا اوقات ان کا کپڑا دیوار سے اٹک جاتا تھا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَيْسَ لِلنِّسَاءِ وَسَطُ الطَّرِيْقِ))(۳۶)

''عورتوں کے لیے مناسب نہیں کہ وہ راستے کے بالکل درمیان میں چلیں۔''

اس فوری حکم کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے مسجد سے نکلتے وقت عورت ومرد کو اختلاط سے بچانے کے لیے دو مزید قدم اٹھائے:

اوّل: مسجد کے ایک دروازے کو عورتوں کی آمد ورفت کے لیے خاص کر دیا۔ چنانچہ امام ابوداؤد ؒ اپنی کتاب السنن میں باب باندھتے ہیں: باب اعتزال النساء فی المساجد عن الرجال۔ یعنی ''مسجدوں میں عورتوں کا مردوں سے الگ تھلگ رہنے کا بیان''۔ پھر اس کے تحت ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((لَوْ تَرَكْنَا هٰذَا الْبَابَ لِلنِّسَاءِ))(۳۷) ''اگر اس دروازے کو ہم عورتوں کے لیے خاص کر دیں (تو بہتر ہوگا)۔'' حضرت نافع ؒ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ سے یہ فرمان سن لینے کے بعد حضرت عبد اللہ بن عمر ؓ اپنی وفات تک اس دروازے سے داخل نہیں ہوئے۔

دوم: مرد وزن کو اختلاط سے بچانے کے لیے آپ ﷺ نے دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ آپ ﷺ خود نماز سے فارغ ہونے کے بعد کچھ دیر کے لیے اپنی جگہ بیٹھے رہتے اور مردوں کو بھی ہدایت دیتے کہ وہ بھی کچھ دیر بیٹھ کر اٹھیں، تاکہ عورتیں اپنے گھروں کو واپس جاسکیں اور راستے میں دونوں جنسوں کے اختلاط کی نوبت نہ آنے پائے۔ چنانچہ حضرت اُمّ سلمہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ عہدِ نبوی ﷺ میں جب عورتیں نماز سے فارغ ہوتیں تو فوراً اُٹھ کھڑی ہوتیں، رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھنے والے مرد کچھ دیر اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہتے، جب رسول اللہ ﷺ اپنی جگہ سے اٹھ جاتے تو مردوں کی جماعت بھی اُٹھ کھڑی ہوتی۔(۳۸)

صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ جب نماز سے سلام پھیرتے تو عورتیں اپنے گھروں کے لیے واپس ہو جاتیں اور آپ ﷺ کے اپنی جگہ سے اٹھنے سے پہلے پہلے وہ اپنے گھروں کو پہنچ چکی ہوتیں۔(۳۹)

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر ؒ لکھتے ہیں: ''اس حدیث میں ایک اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ گھروں کی بات تو دور کی ہے، راستوں میں بھی مرد وزن کا اختلاط ناپسندیدہ چیز ہے۔''(۴۰)

قارئینِ کرام! قابلِ غور مقام ہے کہ جب مساجد اور ان کی طرف آنے جانے والے راستوں کے بارے میں یہ حکم ہے، جہاں ہر شخص خالص عبادت کے جذبہ سے آتا ہے تو دوسری عام

جگہیں جہاں شرم وحیا کی کوئی قید نہیں ہوتی' وہاں اختلاطِ مردوزن کس طرح جائز ہوسکتا ہے؟ آج ہمارے ماحول میں ناجائز مراسم کے عام ہونے کا ایک بہت بڑا سبب اسکولوں' کالجوں' دفتروں اور بازاروں وغیرہ میں مردوزن کا اختلاط ہے' بلکہ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو عشق ومعاشقہ' زنا بالجبر اور زنا کے واقعات کا بہت بڑا سبب مردوزن کا اختلاط ہے۔ خاص طور پر سکولوں' کالجوں' کام کی جگہوں اور وسائل نقل وحرکت میں اختلاط تو اخلاقی برائیوں کے علاوہ اور بھی بہت سی خرابیوں کا سبب بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب غیر مسلم دانشور خصوصاً یورپ کے لوگ اس کے خلاف آواز اٹھانا شروع کر چکے ہیں اور اپنی حکومتوں سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ خصوصی طور پر تعلیم گاہوں اور جائے عمل (دفاتر وغیرہ) میں مردوزن کے اختلاط پر پابندی لگائی جائے۔(۴۱)

انڈیا کے ایک ہندی میگزین میں ایک اصلاحی مضمون چھپا تھا' جس میں مضمون نگار کے کے گپتا' نے معاشرہ کو اس طرف متوجہ کرنا چاہا تھا کہ آج ہمارا ملک جو زنا بالجبر کے لیے ایک تجربہ گاہ بنتا جا رہا ہے اس کی طرف جلد توجہ دینے کی ضرورت ہے' ورنہ ملک تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ مضمون نگار نے بطورِ مثال کئی واقعات کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اگر ان واقعات کے اسباب پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو ہر شخص یہ اقرار کرنے پر مجبور ہوگا کہ یہ واقعات سکولوں' سڑکوں اور وسائلِ نقل وحرکت میں اختلاط کے نتیجے میں رونما ہوئے ہیں۔(۴۲)

حاصلِ کلام یہ ہے کہ ضرورت ہے کہ معاشرے کے غیرت مند علماء' مشائخ' دانشور' کالم نگار حضرات اور سماجی کارکن اس طرف توجہ دیں اور اپنی نسل کو تباہی سے بچائیں۔

(۳) خلوت پر پابندی

فواحش ومنکرات کی روک تھام کے لیے شریعت نے ایک قدم یہ اٹھایا ہے کہ کوئی بھی مرد کسی اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی اختیار نہ کرے۔ یہ تنہائی خواہ کتنے ہی پاک مقصد کے لیے ہو شریعت اسے جائز قرار نہیں دیتی۔ علمائے شریعت اسے ''خلوت'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے متعدد احادیث میں اس خلوت سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((لَا یَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَۃٍ اِلَّا وَمَعَھَا ذُوْ مَحْرَمٍ ' وَلَا تُسَافِرُ الْمَرْأَۃُ اِلَّا مَعَ

ذِیْ مَحْرَمٍ))(۴۳)

''کوئی بھی مرد کسی (اجنبی) عورت کے ساتھ خلوت اختیار نہ کرے اِلاّ یہ کہ اس عورت کے ساتھ اس کا کوئی محرم ہو' اور کوئی بھی عورت بغیر محرم کے سفر نہ کرے۔''

صحیحین کی ایک اور حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((اِیَّاکُمْ وَالدُّخُوْلَ عَلَی النِّسَآءِ)) فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الْاَنْصَارِ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اَفَرَاَیْتَ الْحَمْوَ؟ قَالَ: ((اَلْحَمْوُ الْمَوْتُ))(۴۴)

''عورتوں کے پاس (تنہائی میں) جانے سے بچو''۔ یہ سن کر ایک انصاری صحابی نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! 'حمو' کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''حمو تو موت ہے۔''

عربی زبان میں ''حمو'' سے مراد شوہر کے قریبی رشتہ دار ہوتے ہیں' جیسے دیور' جیٹھ' شوہر کا چچا اور چچازاد بھائی وغیرہ۔ چونکہ ان لوگوں کے بارے میں پردہ سے متعلق لاپرواہی برتی جاتی ہے جس کے بڑے خطرناک نتائج سامنے آتے ہیں' اس لیے خصوصی طور پر ان سے متعلق سوال ہوا اور سخت لہجہ میں اس سے منع کیا گیا۔(۴۵)

ایک اور حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((وَمَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا یَخْلُوَنَّ بِامْرَاَۃٍ لَیْسَ مَعَھَا ذُوْمَحْرَمٍ مِنْھَا' فَاِنَّ ثَالِثَھُمَا شَیْطَانٌ))(۴۶)

''اور جو شخص اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ وہ کسی عورت کے ساتھ بغیر اس کے کسی محرم کے ہرگز خلوت اختیار نہ کرے' کیونکہ جب بھی کوئی مرد و عورت خلوت میں ہوتے ہیں تو ان کا تیسرا شیطان ہوتا ہے۔''

ان احادیث کی بنیاد پر علماء کا اتفاق ہے کہ کسی بھی اجنبی عورت سے خلوت اختیار کرنا حرام اور ناجائز ہے۔(۴۷)

یہ خلوت خواہ کتنے ہی پاکیزہ مقاصد کے لیے ہو' شریعت کی نظر میں کوئی مقصد اس کے جواز کی دلیل نہیں ہے(۴۸) جیسے تعلیم کے لیے خلوت' علاج کے لیے خلوت' اور کوئی جائز ضرورت پوری کرنے کے لیے خلوت۔ اسی طرح وہ خلوت خواہ کسی کے ساتھ ہو' وہ پیر ہو' مولوی ہو' ڈاکٹر ہو یا کوئی

اور' اگر وہ عورت کا محرم نہیں ہے تو یہ مقاصد وافراد اور ان کی قدسیت اس کے جواز کی سند نہیں دے سکتے۔ کیا خوب کہا خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے قیمون بن مہران سے: لَا تَخْلُوَنَّ بِامْرَأَةٍ وَإِنْ قُلْتَ أُعَلِّمُهَا الْقُرْآنَ ''کسی عورت کے ساتھ خلوت اختیار نہ کرنا خواہ قرآن مجید کی تعلیم ہی کے لیے ہو۔''

بدقسمتی سے ہمارے یہاں لوگ اس سلسلے میں واضح طور پر غفلت برتتے ہیں' خصوصاً دوستوں' استادوں اور ڈاکٹروں کے بارے میں کھلی لاپرواہی برتی جاتی ہے' جبکہ ہر صاحبِ عبرت نگاہ رکھنے والا شخص دیکھ رہا ہے کہ اس لاپرواہی کے بہت ہی خطرناک نتائج سامنے آتے ہیں۔ اگر ہم میں سے ہر شخص اپنی یادداشت کی کیسٹ کو تھوڑا سا پیچھے کرے تو اس کے کانوں میں ایسے متعدد واقعات پڑیں گے جو اسی خلوت کے نتیجہ میں رونما ہوئے ہوں گے۔ عَلٰی سَبِیْلِ الْمِثَالِ:

(۱) کتنے ہی معلّم حضرات اپنی شاگردوں اور معصوم لڑکیوں کی عزّت کے ساتھ کھیل جاتے ہیں۔ میں ایک حافظ صاحب (۴۹) کو جانتا ہوں جو ایک ۱۳' ۱۴ سالہ لڑکی کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ گھر والے بھی کہتے تھے کہ یہ حافظ صاحب ہیں اور قرآن مجید کی تعلیم دیتے ہیں' اس لیے ان سے نہ کوئی پردہ ہے اور نہ ہی خلوت وجلوت میں کوئی فرق ہے۔ لیکن چند مہینوں کے بعد اس کا نتیجہ وہی نکلا جو فطری چیز ہے' چنانچہ ہوا یہ کہ شیطان نے اپنا کام کیا اور ایک رات دونوں چھپ کر نکلے اور دور شہر جا کر کورٹ میرج کر لی اور آج اپنے کیے پر شرمندہ ہیں' کیونکہ ان کی بیوی نے جس طرح سے والدین سے بغاوت کر کے ان کے ساتھ گناہ کا کام کیا' اب خود خاوند کے ساتھ خیانت کر کے دوسروں کے ساتھ گناہ کرتی ہے۔ سچ ہے: ؎

بد نہ بولے زیر گردوں گر کوئی میری سنے
ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے!

(۲) علاج ومعالجہ کے سلسلے میں بھی لوگ خلوت کو برا نہیں سمجھتے۔ آج ہمارے نرسنگ ہوم اور ہسپتال کا ماحول ایسا بن گیا ہے کہ پردہ' خلوت اور شرم گاہ کی طرف دیکھنا کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا' بلکہ جو شخص اسے عیب شمار کرتا ہے وہ بے وقوف' غیر مہذب اور نادان تصوّر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ نرسوں کی ڈاکٹروں کے ساتھ خلوت' مرد نرسوں کی خاتون نرسوں کے ساتھ خلوت اور مریضہ کی ڈاکٹر کے ساتھ خلوت ایک عام عادت بن چکی ہے' حالانکہ اس آزادی کے جس قدر بھیانک نتائج

سامنے آتے ہیں وہ کسی بھی باغیرت اور صاحبِ ضمیر شخص کو چونکا دینے کے لیے کافی ہیں' کیونکہ گاہے بگاہے اخبارات میں وہ خبریں چھپتی رہتی ہیں۔

(۳) ابھی چند سال قبل کی بات ہے کہ فرانس کے شہر ''گولن'' کی رہنے والی ایک عورت نے روتے ہوئے پولیس کے سامنے اخبار نویسوں سے کہا کہ آج کے بعد سے میں اپنی بیٹی کے بارے میں کسی پر اعتماد نہیں کر سکتی اور دنیا کی ہر ماں کو میں یہ پیغام دیتی ہوں کہ کسی بھی ڈاکٹر کے پاس اپنی بیٹیوں کو بھائی' باپ یا کسی محرم کے بغیر علاج کے لیے نہ بھیجیں۔ یہ ایک غیر مسلم دنیا کے بڑے ترقی یافتہ ملک کی ایک ماں کی آواز تھی' لیکن سوال یہ ہے کہ آخر اس نے یہ بڑی عظیم بات کیوں کہی؟ بھائیو! اصل میں اس کے پیچھے ایک عبرتناک حادثہ ہے' کاش کہ آج ہمارے ملکوں کے آزاد خیال اور اپنے آپ کو مہذب کہنے والے ماں باپ اس سے عبرت پکڑتے۔

ہوا یہ کہ اس چیخنے والی ماں کی بیٹی کا ماہواری نظام درست نہ تھا' اس نے اپنی ماں سے صورتِ حال کا ذکر کیا۔ ماں نے اپنی بیٹی کو اپنے فیملی ڈاکٹر کے پاس بھیجا' ڈاکٹر پرانا واقف کار تھا اور اہلِ خانہ سے دوستانہ مراسم بھی تھے۔ ماں نے ٹیلیفون پر ڈاکٹر سے بات کی اور یہ بھی تاکید کر دی کہ واپسی میں لڑکی کو اپنی کار سے گھر پہنچا دے۔ چنانچہ لڑکی ڈاکٹر کے پاس گئی' وہاں مریضوں کی لمبی قطار تھی' ڈاکٹر نے لڑکی کو انتظار کے لیے کہا تاکہ مریضوں سے فارغ ہونے کے بعد اطمینان سے اس کا معائنہ کرے۔ یہ کوئی باعثِ تعجب بات نہ تھی' لیکن شاید ڈاکٹر نے جان بوجھ کر بھی کچھ تاخیر سے کام لیا۔ جب تمام مریضوں سے فارغ ہوا تو معائنہ والے کمرے میں لڑکی کو بلایا اور معائنہ والے بیڈ پر لیٹ جانے کا حکم دیا۔ لڑکی کو کسی بھی قسم کا شبہ نہیں تھا کیونکہ ایک تو وہ فیملی ڈاکٹر اور دوسرے لڑکی کا منہ بولا ''انکل'' —— خلاصہ یہ کہ ڈاکٹر لڑکی کا معائنہ کرنے لگا اور علاج کے بہانے لڑکی کی آنکھوں پر ایک کپڑا ڈال دیا۔ پھر لڑکی کے ساتھ وہ کام بھی کر گیا جو لڑکی اور اس کی ماں کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ لڑکی نے جب اس پر احتجاج کیا تو ڈاکٹر نے اسے ڈرایا اور کہا کہ اگر تم نے کسی سے یہ راز فاش کیا تو تمہیں قتل کر دوں گا۔ لڑکی اپنے گھر واپس ہوئی' اس کی حالت دگرگوں تھی اور اس قسم کے بناوٹی انکلوں کے بارے میں اس کے نظریات بدل چکے تھے' حالانکہ اُس وقت ڈاکٹر کی عمر ۵۸ سال تھی اور وہ ایک مدّت سے اہلِ خانہ کے نزدیک قابلِ اعتماد تھا۔ (۵۰)

ہم نے صرف ایک حادثہ بیان کیا ہے‘ جبکہ اس قسم کے سینکڑوں حادثات گاہے بگاہے اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں اور جو خبریں پوشیدہ رہ جاتی ہیں ان کی تعداد عالم الغیب والشہادہ ہی جانتا ہے۔ قارئین کرام! تعجب اس پر نہیں ہے کہ اس ڈاکٹر نے اپنے پیشے کا لحاظ نہیں کیا‘ کیونکہ جو کچھ ہوا وہ ایک فطری امر تھا‘ تعجب اس پر ہے کہ ہم لوگ اس قسم کے واقعات سے عبرت حاصل نہیں کرتے اور خود وہ لوگ جن کے ساتھ یہ حادثات پیش آتے ہیں وہ آنکھیں اس وقت کھولتے ہیں جب ان کا سب کچھ لٹ چکا ہوتا ہے۔

(۴) اختلاط وخلوت کی سب سے بڑی اور خطرناک صورت گھروں میں ایک ہی خاندان کے افراد یا دوستوں کے ساتھ اہلِ خانہ کا اختلاط اور غیر محرم سے خلوت ہے جس کے غلط نتائج اس کثرت سے رونما ہوتے ہیں کہ بیان سے باہر ہیں۔ ہر صاحبِ بصیرت اس کو کھلی آنکھوں دیکھ رہا ہے کہ گھروں میں اختلاط اور خلوت کی وجہ سے دیور اور بھابی‘ سالی اور بہنوئی‘ دوست اور دوست کی بیوی وغیرہ کے ساتھ غیر شرعی اور ناجائز تعلقات کے واقعات کثرت سے رونما ہو رہے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص ایسے سینکڑوں واقعات کا علم رکھتا ہے اور جو واقعات چھپے رہ جاتے ہیں ان کی تعداد معلوم نہیں کتنی ہوگی؟ سچ کہا ہے ہندوستان میں عورتوں کے معاملات سے دلچسپی رکھنے والی کمیٹی کے صدر نے کہ چھیڑ چھاڑ‘ زنا بالجبر اور اغوا کے وقعات اس کثرت سے پولیس ریکارڈ میں ہیں تو حقیقت میں کتنے ہوں گے؟ اس ریکارڈ سے اصل حقیقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔(۵۱)

اور جو باتیں صرف جذبات وخیالات‘ نظر اور دل کے گناہ تک رہ جاتی ہیں اس کا علم تو صرف عالم الغیبِ والشهادہ اور علیمٌ بذاتِ الصُّدور ہی کو ہے۔ لیکن یہ بات واضح رہے اور ہر وہ شخص جو آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے‘ یہ دھیان میں رکھے کہ یہ خیالات و جذبات اور ان کا معاملہ ختم نہیں ہوا‘ بلکہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان پر بھی لوگوں کا محاسبہ کرے گا۔ سچ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے:

﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾ (البقرۃ)

’’آسمان اور زمین کی ہر چیز اللہ ہی کی ملکیت ہے۔ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اسے تم

ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تعالیٰ اس کا حساب تم سے لے گا۔ پھر جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے سزا دے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔‘‘

(۵) ایک روشن خیال ڈرائیور کو مَیں جانتا ہوں جو ہندوستان کے ایک مشہور شہر میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا اور اپنے چھوٹے سے گھر میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ اپنے ایک دوست کو بھی رہائش دے رکھی تھی۔ آپس میں نہ تو کوئی پردہ تھا اور نہ اختلاط وخلوت سے متعلق کوئی پابندی تھی‘ کیونکہ یہ فقرہ زبان زدِ خاص وعام ہے کہ ’’آپس میں پردہ نہیں ہوتا‘‘۔ کچھ دنوں کے بعد اپنی بیوی کو اپنے اصلی شہر میں گھر بنا کر چھوڑ آیا اور گھر کا ایک حصّہ اپنے دوست کو بھی اس کی بیوی بچوں کے ساتھ کرائے پر دے دیا۔ چونکہ آپس میں پردہ تو پہلے ہی سے نہیں تھا اس لیے موصوف کی عدم موجودگی میں خلوت واختلاط کے اور بھی مواقع فراہم ہوئے‘ پھر نتیجہ وہی ظاہر ہوا جو ایسی صورت میں فطرتاً ظاہر ہوتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد جب یہ صاحب گھر واپس آئے تو دیکھا کہ دوست اور بیوی کے درمیان تعلقات کچھ اور ہی رخ اختیار کر چکے ہیں‘ چنانچہ اس پر سخت برہمی کا اظہار کیا اور اپنے پرانے دوست کو گھر سے نکال دیا‘ لیکن یہ کام اس وقت کیا جب معاملہ بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ چنانچہ ایک دن ایسا ہوا کہ بیوی اپنا سارا زیور‘ گھر کے کاغذات اور بینک میں جمع شدہ رقم لے کر اپنے عاشق یعنی شوہر کے اس دوست کے ساتھ فرار ہوگئی اور اپنے پیچھے اپنے تین بچوں اور پورے خاندان کو چھوڑ گئی۔ اب وہ بیچارے بجز اس کے اور کیا کرتے کہ جو اکبر الٰہ آبادی نے لکھا ہے اس کو گنگناتے اور سسکیاں بھرتے: ؎

کیا گزری جو اک پردہ کے عدو رو رو کے پولس سے کہتے تھے
عزّت بھی گئی‘ دولت بھی گئی‘ بی بی بھی گئی‘ زیور بھی گیا!

ہر شخص اس قصہ پر غور کر کے معلوم کر سکتا ہے کہ اس کا سب سے اہم سبب غیر محرم کے ساتھ اختلاط اور خلوت ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ظاہری و باطنی گناہوں اور اخلاقی خرابیوں سے بندوں کو بچانے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اختلاط وخلوت کو حرام قرار دیا ہے‘ حتیٰ کہ بعض علماء کا خیال ہے کہ وہ جانور جو عورتوں کے بارے میں جنسی جذبات رکھتے ہیں یا ایسے غلیظ کام کے لیے ان کی مشق کرائی جاتی ہے‘ جیسے کتے‘ بندر وغیرہ‘ ان کے ساتھ بھی خلوت جائز نہیں ہے۔ اسی طرح جو لوگ اپنے اندر بعض

مادّہ جانوروں کے بارے میں جنسی جذبات محسوس کریں ان کے لیے ایسے جانوروں کے ساتھ بھی خلوت جائز نہ ہوگی۔(۵۲) (جاری ہے)

حواشی

(۲۹) مسند احمد: ۴۲۱/۴، سنن ابی داؤد: ۴۸۸۰، الادب، بروایت ابو برزہ اسلمی ؓ، دیکھئے: صحیح سنن ابی داؤد ۱۹۷/۳۔

(۳۰) الادب المفرد: ۳۴۲۔

(۳۱) الادب المفرد: ۳۲۵۔

(۳۲) الادب المفرد: ۳۲۶۔ ان آثار کو علامہ البانی ؒ نے صحیح الادب المفرد میں صحیح قرار دیا ہے۔

(۳۳) بہت سے لوگوں کو یہ بات بڑی عجیب محسوس ہوگی کہ ایک عورت کا کسی عورت سے پردہ کرنے کا کیا معنی ہے؟ لیکن حق یہ ہے کہ قرآن مجید کا یہ حکم بڑی حکمت پر مبنی ہے۔ مجھے ایک ایسی عورت کے بارے میں معلوم ہوا جو زچگی کے بعد عورتوں کے جسم کی مالش کیا کرتی تھی اور ہر عورت کے جسم کی کوئی ایسی علامت ضرور یاد رکھتی تھی جو کسی ایسی جگہ ہو جہاں عام عورتوں کی نظر نہ پہنچ سکے، جیسے ران وغیرہ، پھر اس بات کو جا کر بعض مردوں کو بتلا دیتی جن سے اس کے غلط تعلقات ہوتے۔ اس طرح وہ بات لوگوں میں عام ہو جاتی اور نتیجہ یہاں تک پہنچتا کہ ان پاکیزہ اور عفیفہ عورتوں کے شوہر انہیں طلاق دے دیتے۔

(۳۴) صحیح البخاری: ۵۲۳۵، النکاح، صحیح مسلم: ۲۱۸۰، الاستئذان، بروایت اُمّ سلمہ ؓ۔

(۳۵) سنن ابی داؤد: ۵۲۷۲، الادب، شعب الایمان للبیہقی: ۷۴۳۷، بروایت ابو اسید انصاری ؓ، دیکھئے: صحیح سنن ابی داؤد ۲۹۵/۳۔

(۳۶) صحیح ابن حبان: ۵۵۷۲، شعب الایمان: ۷۴۳۷، ۲۴۱/۱۰، بروایت ابو ہریرہ ؓ، دیکھئے: الصحیحۃ ۸۵۶۔

(۳۷) سنن ابی داؤد مع عون المعبود: ۱۳۰/۲۔

(۳۸) صحیح البخاری: ۸۶۶، الصلاۃ، سنن ابی داؤد: ۱۰۵۰، الصلاۃ، سنن النسائی: ۱۳۳۴، الافتتاح۔

(۳۹) صحیح البخاری: ۸۵۰، الصلاۃ۔

(۴۰) فتح الباری: ۳۳۶/۳۔

(۴۱) مجلۃ المسلمون، عدد: ۱۱۸، رمضان ۱۴۰۷ھ مطابق ۹ مئی ۱۹۸۷ء۔ نیز دیکھئے: انگریزی ماہر تعلیم و تربیت بیورلی شو (Beverly Shaw) کے کتابچہ کا عربی ترجمہ بنام "الغرب یتراجع عن التعلیم المختلط" ترجمہ: ڈاکٹر وجیہ حمد عبدالرحمن۔

(۴۲) دیکھئے: انوکھی کہانیاں عدد: ۴۷، سال ۲۰۰۶ء، صفحہ ۱۲۲ اور اس کے بعد۔

(۴۳) صحیح البخاری: ۱۸۶۲، جزاء الصید، صحیح مسلم: ۱۳۴۱، الحج، بروایت ابن عباس ؓ۔ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔

(۴۴) صحیح البخاری: ۵۲۳۲، النکاح، صحیح مسلم: ۲۱۷۲، الاستیذان، بروایت عقبہ بن عامر ؓ۔

(۴۵) دیکھئے: شرح مسلم للنووی ۱۵۴/۱۴، فتح الباری: ۳۳۱/۹۔

(۴۶) مسند احمد: ۳۳۹/۳، بروایت جابر بن عبداللہ ؓ۔

(۴۷) شرح مسلم للنووی ۱۰۹/۹، فتح الباری ۷۷/۴۔ ان احادیث میں محرم سے مراد وہ مرد ہے جس کا نکاح اس عورت سے ابدی طور پر حرام ہو، البتہ جو لوگ وقتی طور پر حرام ہیں وہ محرمیت میں داخل نہیں ہیں، جیسے سالی، بیوی کی خالہ، بیوی کی بھانجی و بھتیجی اور اس طرح کی وہ قریبی رشتہ دار عورتیں کہ بیوی کی موجودگی میں ان سے نکاح جائز نہیں ہے۔ (فتح الباری ۷۷/۴، ۳۳۲/۹)

(۴۸) البتہ اگر کوئی ناگزیر ضرورت پیش آ جائے تو اس کے لیے یہ حکم نہیں ہے، بلکہ خلوت جائز ہوگی، البتہ اس کے لیے کچھ حدود و قیود ہیں جن کا پاس و لحاظ رکھنا ضروری ہے، جیسے پردہ، غضِّ بصر اور دونوں میں مناسب دوری۔ (شرح مسلم للنووی: ۱۹۰/۹۔)

(۴۹) ہم نے حافظ صاحب کی مثال اس لیے نہیں دی ہے کہ دوسرے لوگ اس سے بری ہیں۔ ہرگز نہیں، بلکہ دوسرے استادوں سے اس قسم کی نازیبا حرکتیں حافظ صاحب کے مقابلہ میں کثرت سے ہوتی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جب حافظ و مولوی صاحب سے ایسی حرکتیں ہو سکتی ہیں اور ان سے خلوت جائز نہیں ہے تو دوسرے لوگ تو بدرجہ اولیٰ اس حکم میں آتے ہیں۔

(۵۰) صراخ الفطرۃ: ص ۲۵-۱۸۔

(۵۱) انوکھی کہانیاں: ص ۲۴۔

(۵۲) "الاختیارات الفقہیہ" شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ: ص ۲۰۱۔

توکّل کی حقیقت اور اس کی فضلیت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

انسان کی کوئی آرزو یا خواہش ہو تو اس کو پورا کرنے کے جائز وسائل اختیار کرنا‘ پھر اللہ پر بھروسہ کرنا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا اور یقین رکھنا کہ وسائل تو مسنون درجے میں اختیار کیے ہیں‘ وسائل پر بھروسہ نہیں‘ بھروسہ تو صرف اللہ پر ہے۔ اسی طرح کوئی بیماری یا مشکل ہو تو اُس کے دور کرنے کے لیے دوائی استعمال کرنا یا مشکل کے حل کے لیے جائز ذرائع اختیار کرنا اس یقین کے ساتھ کہ صحت دینے والا اور مشکل سے نجات دینے والا تو بہر حال اللہ تعالیٰ ہی ہے‘ اسے توکّل کہتے ہیں۔

یہ رویہ توکّل کے خلاف ہے کہ انسان خود کچھ نہ کرے اور اللہ پر بھروسہ کرنے کا دعویٰ کرے کہ وہ صحت دے دے گا یا مشکل حل کر دے گا۔ ایسا توکّل اس لیے بھی صحیح نہیں کہ انسان کو عقل و شعور سے نوازا گیا ہے اور اگر وہ انسانی شرافت سے کام نہ لے تو گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی ناشکری کی۔ جانوروں کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے حسب حال روزی کا انتظام کر رکھا ہے اور وہ روزی کمانے کے لیے کوئی ذریعہ اختیار نہیں کر سکتے۔ اب اگر انسان بھی روزی کمانے کے معاملے میں یا کسی مشکل‘ بیماری یا مصیبت کے مداوے کے لیے اپنی عقل اور شعور استعمال نہ کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس نعمت کی ناقدری کرتا ہے۔ قرآن مجید میں بار بار اللہ تعالیٰ پر توکّل کا حکم دیا گیا ہے۔ سورۂ آل عمران (آیت ۱۲۳)‘ سورۃ المائدۃ (آیت ۱۱)‘ سورۃ التوبہ (آیت ۵۱)‘ سورۃ التغابن (آیت ۱۳) اور سورۃ المجادلۃ (آیت ۱۰) میں یہ الفاظ تکرار و اعادہ کے ساتھ وارد ہوئے ہیں: ﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ ”اور اہلِ ایمان کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے“۔ جبکہ سورۂ ابراہیم میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝١٢﴾ ”اور بھروسہ کرنے والوں کو اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے۔“

انسان سوچ سمجھ کر اپنے کام کے لیے جائز راستہ اختیار کرے اور پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر بھروسہ کر کے اس کو انجام دے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝١٥٩﴾ (آل عمران) ”(اے نبی ﷺ!) جب آپ پختہ ارادہ کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کریں۔ بیشک اللہ بھروسہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے“۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اللہ پر توکّل کرنے کا حکم ہے تو تمام مسلمانوں کو بھی یہی حکم ہے۔ اپنی عقل وفکر کے مطابق جائز اسباب اختیار کرنا ضروری ہے اور یہی توکّل ہے‘ جبکہ ان ظاہری اسباب کو فیصلہ کن سمجھنا توکّل کے خلاف ہے۔ مریض اگر ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے تو وہ جائز اسباب اپنا رہا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھ رہا ہے کہ ڈاکٹر کے پاس شفا ہے‘ بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ اسباب میں تاثیر اللہ ہی ڈالتا ہے۔ کوئی شخص اگر اگلے دن صبح سفر کو جانا چاہتا ہے‘ سارے اسباب کا اُس نے انتظام کر رکھا ہے‘ اب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا تو اُس کے فراہم کردہ اسباب اُس کے کام آئیں گے‘ ورنہ نہیں۔ ان شاء اللہ کا یہی مطلب ہے کہ اسباب تو سارے مہیا ہیں مگر اللہ کو منظور ہوا تو یہ اسباب نتیجہ خیز ہوں گے۔ الغرض ترکِ اسباب نہ توکّل کی حقیقت میں شامل ہے‘ نہ اس کے لیے شرط ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ اسباب کا محتاج نہیں اس لیے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص اسباب اختیار نہیں کرتا تو بھی اللہ تعالیٰ اُس کی چاہت پوری کر دیتا ہے۔ اللہ عزّوجل تو مسبب الاسباب ہے۔ اس کی مرضی ہو تو وہ خود کسی کے لیے اسباب بھی پیدا کر دیتا ہے‘ جن کو اختیار کر کے بندہ اپنے ارادہ میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

چونکہ ظاہری اسباب نظر آتے ہیں اس لیے اکثر آدمی دھوکا کھا جاتا ہے اور اُن پر اعتماد کر لیتا ہے۔ ان اسباب کا کامیاب ہونا بھی اور ناکام ہونا بھی اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ عزمِ مصمّم ہو تو بھی بھروسہ اللہ پر ہی ہوگا۔ انسان اگر پورے یقین کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر توکّل کرے تو اللہ تعالیٰ اُس کے لیے کافی ہو جاتا ہے‘ جیسا کہ سورۃ الطلاق میں ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ﴾ (آیت ۳) ”اور جو کوئی اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ اُس کے لیے کافی ہو جاتا ہے“۔ توکّل یہ ہے کہ انسان اپنی سی کوشش اور جِدّ وجُہد کر کے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے۔ یہی اسلام کی تعلیم ہے اور یہی بات حق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ؕ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝٣٨﴾ (الزمر) ”(اے نبی ﷺ!) کہیے میرے لیے اللہ کافی ہے‘ اور توکّل کرنے والے اسی پر توکّل کرتے ہیں“۔ نفع اور نقصان کسی کے ہاتھ میں نہیں‘ اس لیے بس اللہ

تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلانا ہی حق ہے اور اپنے معاملے کو اس کے سپرد کر دینا ہی کافی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۶۴﴾ (الانفال) ''اے نبی (ﷺ!) آپ کے لیے اور آپ کے پیروانِ ایمان کے لیے تو بس اللہ کافی ہے۔''

گویا اسی شخص کا معاملہ صحیح ہے جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے۔ پرندے اللہ پر بھروسہ کر کے صبح اپنے آشیانوں سے نکلتے ہیں اور دانا دنکا چگتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر واپس لوٹتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو جیسا کہ توکّل کا حق ہے تو وہ تمہیں اس طرح رزق دے گا جیسا کہ پرندوں کو رزق دیتا ہے۔ وہ صبح کو بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے اپنے گھونسلوں میں آ جاتے ہیں۔'' (ترمذی، عن عمر بن الخطابؓ) چونکہ ان کو روزی کمانے کے لیے عقل وشعور اور مناسب اعضاء وقویٰ نہیں دیے گئے اس لیے اُن کا اللہ پر یہ توکّل درست ہے۔ مگر انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنا معاملہ حل کرنے کے لیے پوری جِدّوجُہد کرے، تاہم بھروسہ اللہ پر ہی رکھے، کیونکہ ہوگا وہی جو منظورِ خدا ہوگا۔ جِدّوجُہد کرنا ایسا ہو کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کے کارساز ہونے کا یقین ہی اصل ایمان ہے۔ تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے یہی تعلیم دی اور اسی تعلیم پر عمل کیا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو وہ آگ کا الاؤ دیکھ کر خوف زدہ نہیں ہوئے، بلکہ وہ اس یقین کے ساتھ آگ میں کود گئے کہ بھروسہ تو اللہ پر ہے، اُس کی منشا کے بغیر آگ بھی نہیں جلا سکے گی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا: ﴿يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ ۝۶۹﴾ (الانبیاء) ''اے آگ! تو ابراہیمؑ پر خنکی اور سلامتی والی ہو جا'' چنانچہ آپؑ اس آگ سے صحیح سالم باہر نکل آئے ؎

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا!

جب جنگ بدر میں مالِ غنیمت ہاتھ آیا اور اُس کی تقسیم کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اختلافِ رائے ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں توکّل علی اللہ کی تعلیم دی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۲﴾ (الانفال)

''بس ایمان والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ جب اللہ کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر توکّل کرتے ہیں۔''

شیطان انسان کا دشمن ہے اور وہ ہر وقت اُسے گمراہ کرنے میں لگا رہتا ہے، مگر جو اللہ پر بھروسہ کرنے والے ہیں شیطان کا ان پر بس نہیں چلتا۔ اور جو شیطان کے اغوا سے محفوظ رہا وہ کس قدر خوش نصیب ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۹۹﴾ (النحل) ''شیطان کو ان لوگوں پر تسلط حاصل نہیں ہوتا جو ایمان لاتے ہیں اور اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں''۔ پس اللہ پر توکّل انسان کو شیطان کے حملوں سے محفوظ رکھنے کا بھی مؤثر ذریعہ ہے۔ ایک متفق علیہ حدیث میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے: ((اَللّٰھُمَّ لَکَ اَسْلَمْتُ، وَبِکَ آمَنْتُ، وَعَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ، وَاِلَیْکَ اَنَبْتُ، وَبِکَ خَاصَمْتُ ...الخ)) ''اے اللہ! میں تیری اطاعت کے لیے فرمانبردار ہو گیا، اور تیرے ہی اوپر ایمان لایا، اور میں نے تجھ پر ہی بھروسہ کیا، اور میں نے تیری ہی طرف رجوع کیا، اور تیری ہی طرف اپنا محاکمہ پیش کرتا ہوں......''

ظاہری اسباب جو سامنے نظر آتے ہیں اُن میں سے جائز اسباب کو اختیار کرنا رسول اللہ ﷺ کا طریقہ اور آپؐ کی تعلیم ہے۔ یہ راستہ فلاح اور نجات کا راستہ ہے۔ اسباب اختیار کیے بغیر اللہ پر بھروسہ درست نہیں۔ اگر کسی کے پاس سواری کا جانور ہے اور وہ راستے میں نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں جاتا ہے تو اُسے اپنے جانور کو مسجد کے باہر کسی کھونٹے کے ساتھ باندھنا ہوگا۔ یہی مطلب ہے اس کا کہ اللہ پر توکّل کرنے والا اپنے اونٹ کا گھٹنا باندھے۔ ضروری ہے کہ ہر شخص اپنی چیزیں حفاظت سے رکھے اور پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے۔ اگر اس نے اپنا سامان حفاظت کے بغیر رکھا تو چور آسانی سے وہ مال چرا لے گا۔ پھر ایسے چور کی سزا قطع ید نہیں، کیونکہ صاحبِ مال نے اپنا مال بے حفاظت رکھ کر غلط توکّل کیا اور چور کو چوری کے لیے سہولت بہم پہنچائی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو تمام معاملات میں صحیح معنوں میں توکّل اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

❀❀❀

July 2020
Vol.69

Regd. CPL No.115
No.7

Monthly **Meesaq** Lahore

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

وفاق المدارس سے الحاق شدہ

کُلّیۃ القرآن (قرآن کالج) لاہور

191۔ اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

”تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو خود قرآن سیکھتے ہیں اور دوسروں کو قرآن سکھاتے ہیں۔“ (حدیث نبوی ﷺ)

درس نظامی کے ساتھ ساتھ میٹرک (آرٹس، سائنس)۔ ایف اے۔ بی اے اور ایم اے کے خواہش مند طلبہ کے لیے

آن لائن داخلے شروع

- کرونا وائرس اور لاک ڈاؤن کی وجہ سے لاہور تشریف لائے بغیر بذریعہ واٹس ایپ اپنے کوائف ارسال کریں۔ مطلوبہ قابلیت کا جائزہ لینے کے بعد داخلہ دینے یا نہ دینے کے بارے آپ کو اطلاع کر دی جائے گی۔
- ریگولر کلاسز کے لیے حکومت پاکستان/وفاق المدارس کی ہدایات کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔
- کوائف ارسال کرنے کے لیے درج ذیل نمبروں پر رابطہ کریں۔

1۔ مولانا محمد فیاض صاحب 0322-4939102
2۔ شہریار صاحب 0301-4882395

خصوصیات

- دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم
- حفاظ، ذہین اور مستحق طلبہ کے لیے مراعات
- وفاق المدارس العربیہ اور لاہور بورڈ/پنجاب یونیورسٹی کا نصاب
- نمایاں پوزیشن والے طلبہ کے لیے وظائف

المعلن: حافظ عاطف وحید، مہتمم — ریاض اسماعیل، پرنسپل